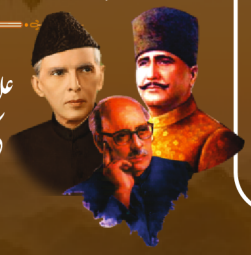
ماہنامہ
فروری 2025ء
طلوعِ اسلام
لاہور
اشاعت کا اکیاسی واں سال

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ



پرویز علیہ الرحمۃ

09 جولائی 1903ء | 24 فروری 1985ء

خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے



مفکرِ قرآن علامہ پرویز علیہ الرحمۃ، ڈاکٹر عبدالوہاب عزام (سفیر مصر)، ابوالاثر حفیظ جالندھری



علامہ پرویز علیہ الرحمۃ اپنے رفقاء یوسف علی ضیاء، راجہ محمد اکرم اور عزیز قریشی کے ساتھ

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
فروری 2025ء

جلد 78 شمارہ نمبر 02

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: تعارف: علامہ غلام احمد پرویزؒ	ادارہ	4
تا زبزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں	حاجی حبیب الرحمٰن خاں	6
خُمِ زندگی	علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ	17
درسِ قرآن (سورۃ الفاتحہ آیت نمبر:4)	علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ	39
اللہ پاک، رسول پاک، قرآن پاک	محمد انوار خان، اسلام آباد	56
اقبال کا شاہین ہو کہ پرویز کا سلیم	نفیسہ فریاد چاہل	61

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

تعارف: غلام احمد پرویز

بٹالہ/لاہور

علامہ غلام احمد پرویز مرحوم کی تاریخ پیدائش 9 جولائی 1903ء ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران مرکزی حکومت ہند کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی وہ مرکزی حکومت پاکستان میں منتقل ہو گئے اور 1955ء میں اسسٹنٹ سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

شیدائی ءاقبالؒ ہونے کے ناطے، آپ 1930ء سے مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کے اس تصور کو آگے بڑھاتے رہے جسے حضرت علامہ اقبالؒ نے الٰہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اپنے صدارتی خطبہ میں پیش کیا تھا۔

1937ء کے موسم گرما میں، علامہ اقبالؒ کے ایماء پر حضرت قائداعظمؒ نے اپنے قیامِ شملہ کے دوران علامہ پرویز کو بلا کر فرمایا کہ یہ مولوی صاحبان تحریک پاکستان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، اس کی مدافعت کے محاذ کو میں تمھارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ حضرت قائداعظمؒ کی ہدایت پر وہ تمام ضروری اقدامات کئے گئے جن کے نتیجہ کے طور پر ماہنامہ ''طلوع اسلام'' کے دور جدید کا اجراء، مئی 1938ء کے شمارے کے ساتھ عمل میں آیا۔ اس ماہنامہ میں پرویز صاحب نے قرآن کریم کے عطا فرمودہ ''دوقومی نظریہ'' اسلامی مملکت کی ضرورت اور اس کے بنیادی تقاضوں پر گرانقدر مقالات لکھے۔ اس دوران کانگرسی اور نیشنلسٹ علماء کی طرف سے مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا رہا، اس کا آپ نے موثر دفاع کیا۔

علامہ موصوف اس وقت سرکاری ملازمت میں تھے، اس لئے مسلم لیگ کے سٹیج سے بات کرنا تو ان کے لئے دشوار تھا تاہم دہلی اور اس کے گردونواح کے ایسے تمام شہروں میں جہاں شام کو جا کر اگلے روز علی الصبح واپس آیا جا سکے، مسلم لیگ کے شبانہ جلسوں کے فوراً بعد اسی سٹیج سے بزمِ اقبال کی محفل آراستہ کی جاتی جس میں پرویز صاحب قرآن کریم اور فکر اقبالؒ کی روشنی میں تحریک پاکستان اور مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے تصور کو واضح طور پر قوم کے سامنے پیش کرتے۔

یہ عملی جدوجہد قیام پاکستان تک جاری رہی۔ حتیٰ کہ جب 1946ء میں سرخ پوشوں اور کانگرس کی ملی بھگت سے مسلم اکثریت کے صوبہ سرحد میں، پاکستان میں شمولیت/عدم شمولیت کے سوال پر ریفرنڈم کرانا طے پایا گیا تو پرویز صاحب صوبہ سرحد میں تشریف لے گئے اور اس وقت کے سرحد مسلم لیگ کے صوبائی صدر خان بخت جمال خان اور ان کے رفقاء کی معاونت سے صوبہ کی کانگرسی وزارت اور سرخپوش لیڈر خان عبدالغفار خان کو ہمہ جہت مخالفتوں کے علی الرغم سرحد کے مسلم عوام کا فیصلہ کن ووٹ پاکستان کے حق میں ڈلوانے میں کامیاب ہوئے۔

علامہ پرویز 1938-1937ء سے حضرت قائداعظم علیہ الرحمۃ کے تحریک پاکستان کی دینی اساس کے موضوع پر ذاتی مشیر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ یہی وہ واحد شخصیت تھی جنہیں حضرت قائداعظمؒ سے پیشگی وقت لئے بغیر ان کی خدمت میں، کسی وقت بھی باریابی کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ قائداعظمؒ نے قرآنی ہدایات سامنے آجانے کے بعد ہمیشہ انہی کے مطابق عمل کیا۔ پرویز صاحب ان معدودے چند دانشوروں میں شامل ہیں جنہوں نے بقول پیر علی محمد راشدی، پاکستان کی سکیم کی تیاری میں مدد کی تھی۔

حضرت قائداعظمؒ، علامہ پرویز پر غایت اعتماد رکھتے تھے اور ان کی رائے کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ جب اسکا وقت آیا تو ان سے پاکستان کے سیکرٹریٹ کے لئے مناسب افسروں کے انتخاب کے لئے سفارش طلب کی۔

قیام پاکستان کے بعد اپنی وفات تک جب کسی دریدہ دہن نے بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ یا ان کے رفقاء کے خلاف ہرزہ سرائی کی ناپاک کوشش کی تو یہی مردمجاہد آڑے آیا اور ہر موقع پر ایسے مدلل مقالات سپرد قلم کئے جن سے تحریک پاکستان کے ان زعماء کی عظمت کردار نکھر اور ابھر کر قوم کے سامنے آتی رہی۔

علامہ غلام احمد پرویز نے 24 فروری 1985ء کو وفات پائی۔

(بشکریہ تحریک پاکستان گولڈ میڈل 1989ء؛
شعبہ تحریک پاکستان، محکمہ اطلاعات وثقافت، حکومت پنجاب)

سانحہ ارتحال

نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام جلال پور جٹاں محترم محمد افتخار صاحب کے بڑے بھائی محمد ارشاد صاحب وفات پا گئے ہیں۔
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے اور ان کے اعزہ واقارب کو صبرِ جمیل سے نوازے۔

حاجی حبیب الرحمٰن خاں
انسپکٹر جنرل پولیس (ریٹائرڈ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تاز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

اس سے قبل جب بھی میں نے قلم اٹھایا کہ محترم پرویزؒ صاحب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں، ہاتھ وہیں رُک گئے۔ میں نے اپنے آپ کو اتنا کمزور کبھی محسوس نہیں کیا تھا کہ ایسی زندہ جاوید شخصیت کے متعلق اتنی جلدی یقین کرلوں کہ اب وہ اس فانی دنیا میں نہیں رہے۔ پرویزؒ صاحب میرے استاد، میرے دوست اور انتہائی مشفق بزرگ تھے۔ میری اُن کی یہ رفاقت کم وبیش 34 سال تک رہی اس اثنا میں کئی دوست اس قافلہ کے ساتھ ملے اور چلے گئے لیکن میرے خلوص، محبت اور ہم آہنگی میں ہر روز اضافہ ہی ہوتا رہا۔

جولائی 1952ء کا ذکر ہے۔ مَیں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے (تاریخ) کرنے کے بعد اسی کالج میں لیکچرر لگ گیا۔ اور گرمیوں کی چھٹیوں میں چند دنوں کے لئے کراچی چلا گیا وہاں ایک روز آرام باغ میں ڈاکٹر حمید (مرحوم) (ہومیو پیتھک) کے کلینک میں بیٹھا اخبار، رسالے دیکھ رہا تھا کہ طلوعِ اسلام پر نظر پڑی۔ میں نے اٹھایا، ایک نظر دیکھا، پھر رکھ دیا۔ چونکہ اور کچھ کام کرنے کو نہ تھا، دوبارہ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ عربی زبان سے مجھے کچھ تھوڑی بہت واقفیت تھی۔ اس لئے کہ تاریخ کے بعد میں نے ایم اے عربی کا بھی امتحان دے دیا تھا۔ چند ہی صفحات پڑھے تھے کہ میری نظریں جم گئیں۔ یہ رسالہ دیگر مذہبی رسالوں سے بہت مختلف تھا۔ اس لئے کہ اس میں خالص علمی بحث تھی اور جو بات بھی لکھی گئی تھی اس کا ماخذ قرآنِ کریم اور اس کی سند مستند لغات تھیں، جن سے میں واقف تھا۔ میں کچھ اچنبھے میں آ گیا کہ ایسا رسالہ پاکستان میں چھپ رہا ہے، جس کا ذکر اس سے قبل میں نے نہیں سنا اور نہ ہی میرے اساتذہ نے کیا تھا۔ اسی دوران ڈاکٹر حمید نے میری طرف متجسس نگاہوں سے دیکھا اور پوچھا کہ کیا آپ اس کے مصنف سے ملنا پسند کریں گے؟ میرے لئے اس سے بڑھ کر اور خوشی کی کیا بات ہوسکتی تھی۔ اس لئے کہ بچپن سے لیکر آج تک خوب سے خوب تر کی جستجو میری گھٹی میں رہی اور شاید اسی بنا پر PSYCHIATRIST کی رپورٹ پر مجھے محکمہ پولیس میں دھکیل دیا گیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا کل ہی صبح آٹھ بجے نیپئر بیرکس آجایئے۔ پرویزؒ صاحب وہاں درسِ قرآن دیتے ہیں۔ آپ بھی

سُن لیجئے۔شاید کہ جس چیز کی تلاش میں آپ سالہا سال سے سرگرداں ہیں، وہ آپ کو مل جائے۔اس بات کا ذکر ذرا تفصیل کے ساتھ آگے بیان کروں گا۔

اتوار کی وہ صبح میری زندگی میں ایک نورانی انقلاب لے آئی۔خوش قسمتی سے میں سامعین کی اس محفل میں سب سے پچھلی کرسیوں پر سیاہ چشمہ لگا کے سُن رہا تھا۔جونہی اس مفکرِ قرآن نے ''سورۃ التین'' کی آیات کا مفہوم بیان کرنا شروع کیا، میری آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے۔میں رو نہیں رہا تھا لیکن کوشش کے باوجود آنسو نہ تھمتے تھے۔اللہ اکبر! تو یہ ہے خدا کی وہ کتاب جسے اُس نے کتابِ مبین کہا ہے۔بیشک! لَا رَیْبَ ۛ فِیْہِ ۛ! ایک طرف یہ خواہش موجزن کہ یہ درس کبھی ختم نہ ہو تو دوسری طرف یہ تمنا کہ یہ محفل جلد ختم ہوتا کہ جس شخص نے مجھے میرے گوہرِ مقصود کی طرف رہنمائی کی ہے، اس کے ہاتھوں کا بوسہ لوں۔ایک عجیب کیفیت!

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دِل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

محفل کے اختتام پر تقریباً سب لوگ چپکے سے اُٹھے اور کچھ نہ کچھ سوچتے ہوئے اپنی راہ لئے۔صرف چار پانچ اصحاب باقی رہ گئے۔میں اپنی پچھلی نشست پر بیٹھا اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ڈاکٹر حمید آئے اور پھر اپنے ساتھ لے کر محترم پرویز صاحب کے پاس لے گئے۔تعارف کرایا، ''یہ لڑکا گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر ہے۔C.S.S کا امتحان دیا ہے۔محکمہ پولیس میں منتخب ہو چکا ہے۔کل ہی طلوعِ اسلام دیکھا اور آپ کو ملنے کا اشتیاق اسے آج کشاں کشاں آپ کے درس میں لے آیا۔کل تک اس کی کہانی کچھ اور تھی، اب کس مقام پر ہے۔آپ دیکھ لیں۔۔۔''

درس کے بعد عام طور پر پرویزؔ صاحب بہت کم بات کرتے تھے۔مجھے پاس بٹھا لیا۔چائے آئی۔کچھ دیر بعد ہلکی پھلکی گفتگو ــــــ پھر میں نے اپنی کہانی سنائی۔

میری فرطِ جذبات سے عجیب کیفیت تھی۔ہزاروں سوال ایک ہی سانس میں پوچھنا چاہتا تھا۔میں اُس مسافر کی طرح تھا جو سالہا سال چلتے چلتے مایوس سا ہو گیا ہو۔ہر سمت کچھ دیر کے لیے سفر کر کے رک جائے اور مشکوک سی نظروں سے اپنے راہبر کو دیکھے کہ یہ مجھے جس سمت لے جا رہا ہے، اُس طرف میرا دل و دماغ ساتھ نہیں دیتا۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ۔اور پھر رُک جاتا ہوں۔میرے پاؤں میں زنجیر، میری اپنی سوچ، میرا اپنا علم ڈال دیتا ہے لیکن آج کیفیت مختلف تھی۔مجھے اس مفکرِ قرآن نے صحیح منزل کی طرف اشارہ کر دیا تھا اور وہاں پہنچنے کے لیے راستہ بھی بنا دیا۔''قرآنِ کریم کتابِ مبین ہے۔یہ ایک نور ہے۔واضح دلیل ہے۔اس روشنی کو دیکھنے کے لئے کسی دوسری روشنی کی ضرورت نہیں۔''

عربی زبان جس میں نازل ہوا، زندہ ہے۔اس کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے درجنوں لغات موجود ہیں۔مشکل یہ ہے کہ

ہمارے ہاں قرآنِ کریم کے سینکڑوں الفاظ، اسلامی اصطلاحات کا رنگ لئے موجود ہیں۔ لیکن ان کا اصل مفہوم مفقود ہو چکا ہے۔ مثلاً قرآنِ کریم کے نزول سے پہلے عرب لوگ مومن، کافر، صلوٰۃ، تسبیح، جنت، دوزخ کس کو کہتے؟ انہیں سمجھنے کے لئے اُس دور کی زبان کو سامنے رکھیں، پھر خود غور کریں۔ سوچیں۔ پھر غور کریں کہ یہی منشائے ایزدی ہے اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝۔۔۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ۔۔۔ افَلَا تفکّرُون۔۔۔ تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے۔ تم غور کیوں نہیں کرتے۔ تم سوچتے کیوں نہیں) میرے لیے یہ الفاظ اور یہ Approach ''کھل جا سم سم'' کے مترادف تھا۔ سینکڑوں بت پہلے بھی توڑ چکا تھا، مگر سیدھا راستہ کون سا تھا؟ ___ یہ آج دکھائی دینے لگا۔

اپنی کہانی میں نے یوں بیان کی، آپ بھی سن لیں۔

1944ء کا ذکر ہے۔ میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ میرے بڑے بھائی فوج میں میجر تھے اور دوسری جنگِ عظیم میں برما کے محاذ پر جاپانیوں کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ اُن دنوں ریڈیو وغیرہ کی سہولتیں عام نہیں تھیں۔ بھائی جان کے خطوط ہر ہفتہ اہلِ خانہ کو آتے رہتے تھے تاکہ ان کی خیر و عافیت کا پتہ چلتا رہے۔ اس ہفتہ میرے نام سکول کے پتہ پر خط آیا۔ کھول کر پڑھا دِل کو سکون ملا، پھر دوبارہ پڑھا۔ جمعہ کا دن تھا۔ نماز کے لئے سکول کی مسجد میں چلا گیا۔ خط میری جیب میں میرے دل کے قریب تھا۔ حسبِ معمول امام مسجد نے نماز پڑھائی۔ جونہی قرأت شروع ہوئی۔ میں قرآنِ کریم کی آیات پر غور کرنے لگا۔ کچھ سمجھ نہ آیا۔ عربی زبان سے واقفیت نہ تھی۔ صرف ناظرہ قرآن جانتا تھا۔ دل میں ایک عجیب طوفان برپا ہو گیا۔ پیشانی پر عرقِ ندامت، میرا جسم کچھ گرمی اور کچھ شرمندگی سے بھیگ گیا۔ جسمانی طور پر امام کے پیچھے کھڑا تھا لیکن دل و دماغ ایک عجیب کشمکش میں۔ ایک بھائی کا خط میدان جنگ سے آیا۔ جسے میں نے سینے سے لگایا اور ایک سے زیادہ دفعہ پڑھا۔ میرے دل و دماغ میں سکون اور آنکھوں میں ٹھنڈک اور روشنی پیدا ہوئی۔ ایک یہ ''خط'' جو اللہ تعالیٰ نے جبریلؑ کے ذریعے نبی آخر الزماں پر نازل کیا، جس میں میرے لئے دنیا و آخرت کے لئے ہدایات ہیں۔ جس کا ایک ایک لفظ کروڑوں مسلمانوں کے دلوں پر منقش ہے۔ جو کتاب ایک زندہ معجزہ ہے کتنے افسوس اور شرم کی بات ہے کہ نہ میں اُس کو سمجھ سکتا ہوں نہ اس زبان سے واقف ہوں۔ وہ زبان جو میرے رسول مقبولِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہے۔ وہ زبان جسے اللہ تعالیٰ نے آخری کتاب کے لئے منتخب کیا۔ کتنی جامع، کتنی پیاری خوبصورت ہوگی ___ جی چاہتا تھا۔ نیت توڑ کر بھاگ جاؤں۔ نہ جانے کس طرح ایک بے حس جامد چیز کی طرح فریضہ مکمل کیا اور واپس ہوسٹل میں آ کر اپنے کمرے میں لیٹ گیا۔ رات کیسے کٹی! اسی انتظار میں کہ صبح ہی اپنے گوہرِ مقصود کی طرف پہلا قدم اٹھاؤں گا۔ صبح ہوتے ہی عربی زبان کے استاد سے ملا کہ میں اپنا مضمون تبدیل کرنا چاہتا ہوں اور اس کی جگہ عربی پڑھنا چاہتا ہوں۔ اُس نے سکول کے ہیڈ ماسٹر سید اصغر علی سے بات کی اور پھر کلاس کے انچارج سے۔ دونوں ہی مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ اُن دنوں ہندو، مسلمان اور سکھ لڑکوں کے درمیان سکول میں بڑا صحت مند مقابلہ ہوتا تھا۔ خدا کے فضل سے میرا شمار اچھے طلباء میں ہوتا تھا۔ اور مسلمان اساتذہ اور لڑکے توقع رکھتے تھے کہ اس سال پنجاب

یونیورسٹی، نہیں تو سکول میں مسلمان لڑکا اوّل آئے گا۔ اس لحاظ سے اُن کی نظریں میری طرف تھیں۔ اس لئے دونوں اساتذہ نے اس کی مخالفت کی اور کہا میٹرک کا امتحان آنے والا ہے۔ وقت کم ہے۔ عربی کا کورس از سرِ نو تم مکمل نہ کر سکو گے۔ اچھی پوزیشن لینا تو کجا، شاید فسٹ ڈویژن بھی نہ لے سکو۔ میں بادلِ نخواستہ واپس آ گیا۔ رات پھر آنکھوں میں کٹ گئی۔ کیا کرنا ہے میں نے سکالرشپ! کیا فائدہ ان تمام چیزوں کا جب میرے دل و دماغ کو سکون ہی نہ ہو۔ دوسری صبح پھر حاضر ہوا۔ اپنے اساتذہ کو دل کا ماجرا سنایا کہ عربی زبان پڑھے بغیر میرے دل و دماغ کو سکون نہ مل سکے گا۔ نتیجۃً اجازت مل گئی۔ اس شرط پر کہ سکول کے اوقات کے بعد شام کو عربی کے استاد مجھے تین ماہ تک خصوصی ٹیوشن دیں گے اور میں دوسرے مضامین بھی جاری رکھوں۔ اگر میں نے PROGRESS اچھی دکھائی تو مجھے۔۔۔ سرکاری طور پر مضمون تبدیل کرنے کی اجازت مل جائے گی اور کیا چاہئے تھا۔ مجنوں کی طرح اپنے گوہرِ مقصود کی طرف لپکا۔ تین ماہ میں تین سال کا کورس مکمل کر لیا اور ایسا رٹا لگایا کہ آج تک سبق یاد ہیں۔

عربی زبان میرے ساتھ ساتھ رہی۔ بی اے آنرز بھی عربی میں کیا اور پنجاب یونیورسٹی میں اوّل رہا۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں۔ ایم اے تاریخ امتیازی حیثیت سے کیا۔ مقابلہ کا امتحان دیا۔ پولیس میں آ گیا پھر ایم اے عربی بھی کر لیا۔

یہ سب کچھ کرنے کے بعد عجب مشکل میں آ پھنسا۔ اب قرآنِ کریم بغیر ترجمہ کے سمجھ سکتا تھا لیکن مروجہ تراجم میرا دل و دماغ قبول نہیں کرتا تھا۔ دل اسلام کی محبت سے منور تھا۔ پورے گھر کا ماحول سراسر مذہبی تھا۔ دماغ کسی اور طرف لے جا رہا تھا۔ ہزار سوال اُبھر رہے تھے۔ جن کا جواب میرا کوئی استاد نہ دے سکتا تھا۔

استادِ محترم ترجمہ کرتے ہیں سورہ فاتحہ کا ''سب تعریف اللہ کے واسطے ہے جو سارے جہاں کا پالنے والا ہے۔'' میں پوچھتا ہوں۔ پروفیسر صاحب سے، مولانا صاحب سے کہ یہ کیسا خدا ہے جو تمام کی تمام تعریف اپنے لئے اکٹھی کر رہا ہے۔ وجہ؟ اس لئے کہ وہ سارے جہاں کو پالتا ہے۔ یہ کیا پالنا ہے؟ جس جہاں میں کروڑوں بھوکے ہوں، کروڑوں بیمار ہوں، دوائی کیلئے پیسے نہیں۔ کروڑوں ننگے ہوں جسم پر کپڑا نہیں۔ اگر ایک باپ صبح کے وقت اُٹھے اور اپنے بچوں سے کہے کہ بچو! آؤ سب مل کر میری تعریف کرو کہ میں تمہارا باپ ہوں تمہیں پالتا ہوں۔ اس کے جواب میں بچے کہیں کہ ابا حضور! میں تو ساری رات بھوکا سویا۔ دوسرا کہے میں بیمار رہا۔ کسی نے دوائی نہیں دی۔ تیسرا کہے کہ جسم پر لحاف نہیں تھا۔ سردی میں ٹھٹھرتا رہا۔ ہاں ایک دو بھائی ہیں جنہوں نے عیش میں رات بسر کی۔ کیا تعریف کریں آپ کی!

اور اس طرح کے بہت سے مقام آئے جہاں خود قرآنِ کریم کی ہدایات کے مطابق غور کرتا رہا کہ ''مومن کی نشانی یہ ہے کہ وہ قرآن کی آیات بھی اندھے اور بہرے کی طرح قبول نہیں کرتا۔''

کہانی کو مختصر کرنے کے لیے صرف دو تین ان آیات کا حوالہ دوں گا۔ تاکہ آپ کو بھی اندازہ ہو سکے کہ میں کس کشمکش سے گزرا ہوں:

اللہ کی امانت:

اللہ نے اپنی امانت کائنات میں زمین، آسمان، پہاڑوں کو پیش کی انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ انسان کو پیش کی اُس نے اس امانت کو اٹھالیا۔ انسان کتنا ظالم اور جاہل ہے۔ (33:72)۔ اگر یہ ترجمہ ٹھیک ہے تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ اللہ تعالیٰ انسان کا شکریہ ادا کرتے کہ جو چیز کائنات میں مَیں لئے پھر رہا تھا اور کوئی اٹھا نہ رہا تھا۔ شکر ہے تم نے میری لاج رکھ لی اور اسے اٹھالیا۔ اُلٹا اُسے ظالم اور جاہل کہا جا رہا ہے۔

سورۃ المدثر:

اے کملی اوڑھنے والے! اُٹھ اور لوگوں کو ڈرا۔ اپنے رب کی بڑائی بول۔ اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ۔ اور گندگی سے دور رہ۔۔۔ اور اپنے رب پر صبر کر۔'' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا تصور جو دیگر مسلمانوں کی طرح میرے ذہن میں بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رسالت سے قبل بھی عادات وخصائل کے علاوہ بہت صاف ستھرا لباس پہنتے تھے۔ یہاں تک کہ کفار بھی اس کے گواہ تھے۔ اور یہاں وحی نازل کرنا پڑی۔ جبریل علیہ السلام بھیجنا پڑا کہ اُٹھو یہ گندگی صاف کرو اور پلیدی سے دور رہو! اور پھر اللہ پر صبر کرو۔

''قسم ہے مجھے انجیر کی۔ قسم ہے مجھے زیتون کی۔ قسم ہے مجھے کوہِ طور کی اور قسم ہے مجھے مکہ معظّمہ کی۔ کہ انسان کو ہم نے بہترین تقویم سے پیدا کیا۔''

اس مروجہ ترجمہ پر مشرکین اور مستشرقین مندرجہ ذیل اعتراض کرتے ہیں جو میرے ذہن میں بھی ابھرتے تھے۔

1۔ کسی معاشرے میں اور کسی زبان میں بے جان چیز کی قسم نہیں کھائی جاتی۔ قسم جاندار چیز کی کھائی جاتی ہے یا SYMBOL کی۔ جیسے قسم ہے میرے بیٹے کی، قسم اس ذات کی، قسم اپنی عزت وناموس کی وغیرہ۔

2۔ بار بار قسمیں کھانے والا، بات بات پر قسمیں کھانے والا، کچھ اچھا شخص معلوم نہیں ہوتا۔ دوسرا انسان کہے گا کہ بھئی کوئی ثبوت دو! کوئی ٹھوس بات کرو! یہ کیا ہر بات کو ثابت کرنے کے لئے قسم پر قسم اور وہ بھی بے ربط۔

3۔ ان آیات کا کوئی باہمی ربط نہیں۔ مثلاً انجیر کا زیتون سے کیا تعلق اور کوہِ طور سے کیا واسطہ۔ آپ کیا محسوس کریں گے کہ ایک شخص ہے کہ قسم ہے مجھے ٹیلیفون کی۔ قسم ہے مجھے قالین کی، قسم ہے مجھے میز کی ___ مَیں بہت اچھا ڈاکٹر ہوں۔۔۔

اب آیئے واپس، اتوار کی اُس سہانی صبح کہ جب مفکرِ قرآن اسی سورہ کا ترجمہ کر رہے تھے۔ مندرجہ بالا اعتراض کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ سب ناسمجھی اور غلط ترجمہ کا نتیجہ ہے۔ ورنہ قرآنِ کریم کی یہ عظیم آیات بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ صحیح ترجمہ یوں ہے:

عربی زبان میں ''وَ'' کا استعمال قسم کے لئے بھی ہوتا ہے۔ اور قسم انسان اُس وقت کھاتا ہے جب کسی چیز کو صحیح ثابت کرنا ہو ___ قرآنِ کریم میں جہاں جہاں ''وَ'' کا استعمال ہوا ہے وہ سب اشارے ہیں اُس بات کو ثابت کرنے کے لئے جو اس کے

بعد آنے والی ہے۔ انگریزی زبان میں اسے Reference to the context بھی کہہ سکتے ہیں۔ عیسائی مذہب کا یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ انسان پیدائشی گنہگار پیدا ہوا ہے۔ اور اس ازلی گناہ کو صرف ایک ہی شرط پر دھویا جا سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے پر ایمان لایا جائے۔ یہ بہت بڑی قربانی تھی جو ''خدا کے بیٹے'' نے دی۔ اور بھی دیگر مذاہب میں انسان کی پیدائش کے متعلق طرح طرح کے تصورات تھے۔ قرآنِ کریم نے ان کی یک قلم تردید کی اور کہا کہ یہ سب لوگ جھوٹ بول رہے ہیں اور ان کا عقیدہ غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش بہترین تقویم پر کی ہے۔ پیدائش کے وقت سب بچے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اور میں یہ بات آج نہیں کہہ رہا۔ بلکہ اوّل اوّل جب وحی کا نزول ہوا تو اللہ تعالیٰ نے حضرتِ نوح علیہ السلام کو بھی بتایا۔ (التین وہ پہاڑی جہاں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی لگی) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی (زیتون کے درخت کی طرف اشارہ جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آخری کھانا LAST SUPPER کھایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی یہی پیغام دیا (کوہِ طور کی طرف اشارہ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی نازل ہوئی) اور آج مکہ کی بابرکت گلیوں میں بھی وہی پرانی وحی کی آواز آ رہی ہے۔ کہ پیدائش کے وقت انسان بہترین تخلیق ہے بعد میں وہ پستی کی طرف لڑھک جاتا ہے سوائے اُن کے جو ایمان لاتے ہیں اور عمل صالحہ کرتے ہیں۔

اب دیکھئے ___ اور ان آیاتِ جلیلہ کو دوبارہ پڑھئے۔ باہمی ربط بھی آ گیا۔ آیات بامعنی بھی دکھائی دینے لگیں ___ اور ایک عظیم پیغام جو کہ شرفِ انسانیت کی طرف دلالت کرتا ہے اُس کا سبق بھی مل گیا۔

درس کے ختم ہوتے ہی میری آنکھیں، میرا دل و دماغ، قرآنی نورِ بصیرت سے چمک اُٹھا۔ یکے بعد دیگرے سب مقفل دروازے کھلنے لگے، عجیب نشہ تھا جس سے دل و دماغ معمور ہو گئے۔ قرآنِ کریم کا مطالعہ از سرِ نو شروع کیا اور اب تک جاری ہے۔ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی آیت کریمہ پر دل جھوم اُٹھتا ہے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے ؎

ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است

ایسی کتاب، ایسی آیات کوئی انسان لکھ ہی نہیں سکتا۔

محترم پرویزؒ صاحب سے جنہیں بعد میں احتراماً اور پیار سے ہم باباجی کہنے لگے، میرا تعلق اور واسطہ مسلسل رہا اور جب آخری وقت وہ ہسپتال میں داخل ہوئے وہاں بھی ہفتہ میں ایک دو بار اسلام آباد سے آتا رہا۔

قارئین کی دلچسپی کے لئے اس طویل رفاقت میں سے چند اہم باتیں گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ پرویزؒ صاحب کے دل میں ہمیشہ یہ آرزو موجزن رہی کہ کسی صاحبِ علم و فراست سے ملاقات ہوتا کہ وہ اس کے ساتھ مختلف دینی اور سائنسی علوم پر گفتگو کر سکیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک کے اکثر و بیشتر علماء اور مولوی صاحبان جن میں سے شاید کسی نے بھی آپ کی کتابیں نہیں پڑھی تھیں۔ بلا سوچے سمجھے فتویٰ جاری کر دیتے تھے۔ خطابات میں اور کبھی کبھی ٹیلیفون پر بھی فحش زبان استعمال کرتے تھے۔ اس لئے وہ اِن حضرات سے ملنے سے گریز کرتے تھے۔

کلاسیکل موسیقی سے بہت لگاؤ تھا۔ اُن کے پاس گراموفون ریکارڈز کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا اور عام طور پر درس کے بعد ایک آدھ گھنٹہ کے لئے کچھ احباب کے ساتھ مل کر انہیں سنتے تھے۔ میں حیران تھا کہ علم موسیقی کے متعلق اس قدر گہری سمجھ، انہوں نے کہاں سے حاصل کی۔ راگ دیسی، الیا بلاول، شدہ مکیان، میگھ بہت شوق سے سنتے تھے۔ صبح کے راگ بہت پسند تھے، اساوری اور جونپوری سن کر ایک طرح سے مبہوت ہو جاتے تھے۔ مرے اپنے گھر میں، جب میں لاہور میں تعینات تھا دو چار محفلیں منعقد ہوئیں۔ استاد امانت علی خاں، فتح علی خاں کی آواز سے بہت محظوظ ہوتے تھے۔ ایک محفل میرے گھر میں جولائی 1968ء میں ہوئی جس میں امانت علی خاں کے والد بھی موجود تھے۔ ایسی محفل جمی کہ صبح ہونے کو آئی۔ امانت علی کے والد نے اُٹھ کر پرویز صاحب کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ان بچوں نے ایسے راگ اس لگن سے مجھے بھی کبھی نہیں سنائے۔ راگ، اس کے سر تال اور لے اور اتنی گہرائی، اس قدر بلندی اور اس کا تاثر سب اس لئے ہوا کہ آپ سامنے تشریف رکھتے تھے۔ اس محفل کی ٹیپ میرے پاس اب بھی موجود ہے۔ اس کو سینکڑوں دفعہ سن چکا ہوں۔ راگ باگیشری، کدارا اور ہیمہ وتی سن کر ہمیشہ جھوم اٹھتا ہوں۔ راگ کے دوران پرویزؒ صاحب کی بے ساختہ داد دینے کی آواز بھی دل میں ایک ہیجانی کیفیت برپا کر دیتی ہے۔ محفل کے بعد پرویز صاحب نے امانت علی خاں کے والد کی بہت حوصلہ افزائی کی کہ آپ کی محنت رائیگاں نہیں گئی اور یہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ دونوں بیٹوں کو ایک ساتھ باندھ دیا۔ امانت علی کے پاس سُر ہے، فتح علی کے پاس راگ، دونوں لازم وملزوم ___ موسیقی کی اس محفل میں ایک اور نام کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں اور وہ تھے امراؤ بندو خاں۔ میں نے اس سے بہتر سارنگی اور کسی سے نہیں سنی۔ امراؤ بندو خان کو بھی بہت شوق سے سنتے تھے۔ ایک دفعہ امراؤ نے راگ الیا بلاول گایا (دیاری کہاں گئے وہ لوگ) سن کر بے اختیار پرویز صاحب روئے، بہت آہستہ دبے دبے سے! کہتے تھے، سارنگی تو میں اس کے والد، بندو خاں سے بھی دلی میں سنا کرتا تھا۔ خوش قسمتی سے اس محفل کی ریکارڈنگ بھی میں نے سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ اکثر سنتا رہتا ہوں، راگ دیسی تو اُس نے کمال کا گایا تھا۔

اب آیئے کچھ دوسری باتیں کریں۔ 1963ء، 1964ء میں مَیں ایبٹ آباد میں متعین تھا۔ ہزارہ فیلڈ مارشل ایوب خان کا پیدائشی ضلع تھا اور تقریباً ہر اتوار کو ہری پور یا خان پور آیا کرتے تھے۔ میں اُن کے سیاسی نظریات کی طرف نہیں جانا چاہتا۔ لیکن میں نے اکثر لوگ ان کے مداح پائے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جس قدر شکل وصورت وجیہہ اور خوبصورت دی تھی اُن کا دل بھی اتنا ہی وسیع اور نرم تھا۔ بات کی سمجھ اور اس کی تہہ تک پہنچنے کے لئے زیادہ وقت نہیں لیتے تھے۔ جب بھی اپنے گاؤں یا باغات میں آتے، میں لازمی طور پر وہاں موجود ہوتا تھا۔ اس ماحول میں بہت خوش دکھائی دیتے تھے اور اکثر امور پر کھل کر باتیں کرتے تھے۔ ہم لوگ بھی موقعہ کی مناسبت سے جرأت کر کے چھوٹی موٹی بات کر لیتے تھے۔ میرا چونکہ اسلامی تعلیمات سے دلی لگاؤ تھا۔ موقع پا کر اپنی رائے مختصراً ٹھونس دیتا تھا۔ سن کر اکثر APPRECIATE کرتے تھے۔ ایک دفعہ کہا ''یار! تم اسلام کے متعلق اچھی اور صاف بات کرتے ہو۔ دل و دماغ کو لگتی ہے۔ میں نے بھی کچھ کتابیں

پڑھی ہیں اور ہاں یہ پرویز نامی شخص کون ہے؟ میں نے اُس کی کتاب ''سلیم کے نام'' پڑھی ہے اور مجھے بہت پسند آئی ہے۔ مجھے اور کیا چاہئے تھا؟ ایسے موقعے کب ملتے ہیں! مختصراً تعارف مزید کرایا۔ اور کہا کہ ''سر بہت بہتر ہوگا! کسی وقت آپ ذاتی طور پر اُن سے مل لیں بہت سے سوالات کا جواب آپ کو مل جائے گا۔ اس کے بعد آپ خود دیکھ لیں۔'' اگلے ہفتہ ہی راولپنڈی پریزیڈنٹ ہاؤس میں ملاقات ہوگئی۔ دوسرے ہی دن باغات کی سیر کو آئے مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے ''یارا تیرا پیر'' تو بہت مزیدار باتیں کرتا ہے مجھے بہت خوشی ہوئی مل کر، کچھ کتابیں دے گئے۔ یہ تو بات ہی کچھ اور ہے اور ہاں عجیب بات ہے کہ میری ماں نے بھی پچھلے دنوں یہی بات کہی تھی۔ میں نے کہا ''سر کون سی بات'' کہنے لگے ''پرویز صاحب نے کہا کہ جب تک آپ صدر ہیں، غریب کی روٹی مہنگی نہ کرنا۔ عزتِ نفس اور بنیادی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنا۔ بس یہی اسلام کی بنیاد ہے۔''

میرا دل خوشی سے جھوم اُٹھا۔ اسلام کا اصل پیغام، کسی عام آدمی نہیں، صدر پاکستان تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے بعد جب تک فیلڈ مارشل ایوب خاں صدارت کی کرسی پر رہے اور بعد میں بھی محترم پرویز صاحب سے اُن کا رابطہ رہا۔ دستوری کمیشن مقرر ہوا تو اس کے لئے پرویز صاحب نے خصوصی تجاویز دیں۔ اس ڈرافٹ کو لے کر میں ذاتی طور پر پنڈی گیا۔ اس میں بنیادی حقوق کا چیپٹر بڑا اہم تھا۔ کاش کہ اس پر عمل ہو جاتا تو ملک میں کبھی مارشل لاء نہ لگ سکتا۔ اس میں نقطۂ ماسکہ یہ تھا کہ دستور میں بنیادی حقوق کا مرجع' قرآن کریم کو رکھیں۔ ایک مسلمان ہونے کی جہت سے، مجھے بنیادی حقوق پارلیمنٹ نے نہیں دیے اور نہ ہی یو۔ این۔ او نے۔ اگر یہ حقوق پارلیمنٹ نے دیے ہیں تو پارلیمان انہیں واپس بھی لے سکتی ہے، اس کو تبدیل کر سکتی ہے، اس کو معطل کر سکتی ہے۔ یہ JURISPRUDENCE کا بنیادی اصول ہے۔ لیکن ایک مسلمان جب لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا اعلان کرتا ہے تو وہ ایک طرح سے ایک انمٹ معاہدہ کا اقرار کرتا ہے۔ ''میں اللہ کے علاوہ کسی اور کی تابعداری نہیں کروں گا اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے (آخری) رسول ہیں۔'' جن کی وساطت سے مجھے کچھ حقوق ملے ہیں اور حقوق صرف اور صرف اللہ ہی تبدیل کر سکتا ہے۔

اور اللہ نے اعلان کیا ہے کہ وہ ان کو تبدیل نہیں کرے گا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۶۲﴾ (33:62) بس اتنی سی بات ہے اس کا اعلان اور دستور میں اس شق کا اضافہ آپ کے دستور کو اسلامی بنا دے گا۔ آئندہ کوئی شخص، کوئی جرنیل یہ جرأت نہیں کرے گا کہ بنیادی حقوق معطل کرے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ ملک اسلامی نہیں رہے گا۔ اور اس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل ہو سکتی ہے کہ جب یہ حقوق مجھے کسی انسان نے یا کسی پارلیمان نے نہیں دیے تو انہیں کوئی انسان، کوئی ادارہ کوئی اتھارٹی منسوخ نہیں کر سکتی۔ کچھ اور بھی تجاویز تھیں جن کا ذکر پھر کبھی ہوگا۔

یہ بات سن کر فیلڈ مارشل نے کہا ''بس اتنی سی بات سے دستور اسلامی ہو جائے گا۔'' پرویز صاحب نے کہا ہاں! اور یہ اتنی سی بات قیامت کے دن آپ کے اعمال نامہ میں سب سے وزنی ہوگی۔ دنیا میں پاکستان وہ واحد ملک ہوگیا جہاں بنیادی حقوق معطل ہی نہ ہو سکیں گے۔ ساری دنیا میں ایک یکتا مقام ہوگا۔ فیلڈ مارشل صاحب نے منظور قادر صاحب کی طرف دیکھا

جو وہاں موجود تھے۔ انہوں نے جواب دیا ''صدر صاحب بات اتنی سی ہے مگر دور رس نتائج کی حامل۔ آپ ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس ملک میں کبھی بھی ایمرجنسی نہیں لگ سکتی۔ مارشل لاء وغیرہ تو چھوڑیئے اور کچھ باتیں میں بعد میں بتاؤں گا'' بس پھر کیا تھا۔ بات وہیں رہ گئی اور آج تک وہیں ہے۔

اہم ملاقاتوں کی ایک اور کڑی جناب بھٹو صاحب سے ملاقات تھی۔ پرویزؒ صاحب نے اکثر مضامین سوشلزم اور نظامِ ربوبیت پر لکھے ہیں جو جناب بھٹو صاحب کی نظر سے گزر چکے تھے۔ پہلی ملاقات کا بندوبست جلد ہی ہوگا میں بھی ساتھ گیا اور برابر والے کمرے میں انتظار کرتا رہا۔ کوئی ایک گھنٹے ملاقات ہوئی۔ پرویز صاحب باہر آئے تو بہت خوش اور مطمئن تھے۔ جناب بھٹو صاحب بڑے احترام سے ملے اور انہیں بتایا کہ میں تو آپ کو بڑے عرصے سے جانتا ہوں اور آپ کا تعارف تو میرے والد صاحب نے کروایا تھا۔

''آپ تحریکِ پاکستان میں قائداعظمؒ کے ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے۔ والد صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ جب بھی وقت ملے پرویز صاحب سے ضرور ملنا اور ان کی کتابیں بھی پڑھنا، اُس کے بعد نتیجہ اخذ کرنا یا اثر لینا تمہارے اپنے فیصلے پر ہے۔'' بعد میں بھٹو صاحب سے کئی بار ملے۔ ان ملاقاتوں کا تفصیلی تذکرہ کسی مناسب وقت پر ہوگا۔

میں شورش کاشمیری کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ اس سے مقصد صرف ایک بات کی وضاحت ہے کہ ذاتی علم اور مطالعہ کے بغیر رائے قائم کر لینا کس قدر غلط ہوتا ہے اور جب انسان بذاتِ خود ملتا ہے، کسی کی تحریروں کا مطالعہ کرتا ہے تو یکسر بدل جاتا ہے۔ میں شورش کاشمیری کو ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا۔ صرف ایک دفعہ کالج کے زمانے میں باغِ جناح میں سیر کے دوران اچانک ملاقات ہوگئی۔ میرے ایک دوست نے تعارف کرایا۔ میں نے کہا، کاش میں آپ سے نہ ملا ہوتا اس لئے کہ میرے ذہن میں آپ کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ شورش بلا کے بزلہ سنج تھے۔ فوراً ایک شعر داغ دیا:

ہر شئے قریب آ کے کشش اپنی کھو گئی
وہ بھی علاجِ شوقِ گریزاں نہ کر سکا

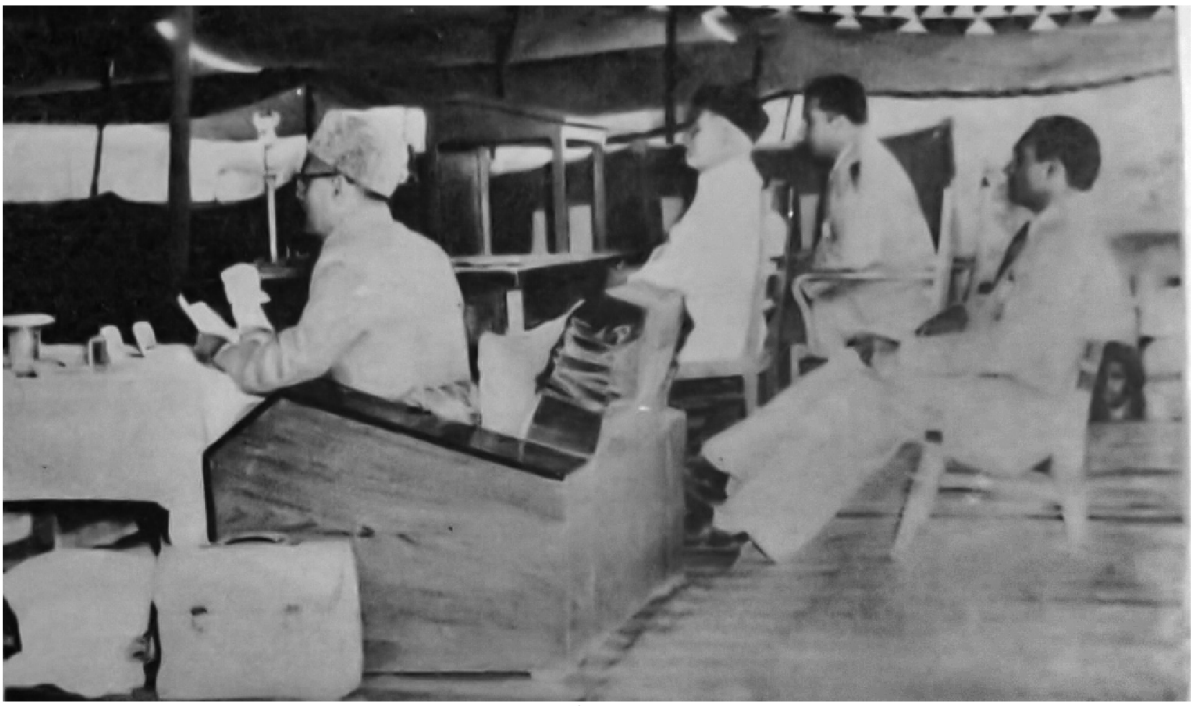
میرے دل میں شورش کاشمیری کی بڑی عزت تھی۔ اُن کا ہفتہ وار رسالہ ''چٹان'' ضرور پڑھتا تھا۔ عشقِ رسول ﷺ اُن کے دل کی گہرائیوں میں موجود تھا جو اُن کی تقریر و تحریر میں نمایاں ہوتا تھا۔ گفتگو کے دوران میں نے پرویزؒ صاحب کی کتاب ''شاہکار رسالت'' کا ذکر کیا کہ اسے ضرور پڑھیں اور کتاب انہیں پیش کی۔ ہفتہ بعد پھر گھر آ گئے اُن کے ہاتھ میں چٹان کا شمارہ تھا جس کے سرورق پر پرویزؒ صاحب کی تصویر تھی۔ آنکھوں میں معذرت کے آنسو! کہنے لگے ''حاجی صاحب آپ نے یہ کتاب دے کر میرے اوپر احسان کیا ہے۔ ایک تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شخصیت پوری طرح ابھر کر سامنے آ گئی اور دوسرا میرے ذہن میں تو پرویزؒ صاحب کا نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ میرے جیسا پڑھنے لکھنے والا شخص بغیر ان کی تحریر دیکھے ایک غلط قسم کا تاثر قائم کرے۔ سر دست اتنا ہی کر سکا ہوں کہ پہلی ہی اشاعت میں ان کی تصویر سرورق پر۔ اور اپنی

معذرت تا کہ قیامت کے دن اللہ کے حضور شرمندگی سے بچ سکوں۔شورش صاحب کی اس جرأتِ رندانہ سے میں بہت متاثر ہوا کہ جب سینہ عشقِ رسول ﷺ سے منور ہوتو روشنی کی ایک کرن سے سالہا سال کے اندھیرے پلک بھر میں چھٹ جاتے ہیں، اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔

اپنی تحریر کے اختتام سے پہلے میں سمجھتا ہوں ایک اور محفل کا ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ مجھے فارسی زبان کا زیادہ علم نہ تھا۔اس لئے علامہ اقبالؒ کا وہ کلام جو فارسی میں ہے اُس سے کما حقہ لطف اندوز نہ ہوسکا۔ پرویزؒ صاحب کی کتاب ''اقبال اور قرآن'' سے بھی کچھ زیادہ حاصل نہ کرسکا اور اس کا ذکر گاہے بگاہے ہوتا رہا 1970ء کے ابتدائی ایام میں طے ہوا کہ پرویزؒ صاحب مجلس اقبال منعقد کریں گے۔کافی عرصہ پہلے وہ اس قسم کی محفل مصر کے سفیر عزام کے ساتھ منعقد کر چکے تھے، جہاں وہ کلامِ اقبال کی تشریح کرتے اور سفیر صاحب اُس کا عربی میں ترجمہ کرتے۔ ہماری محفل تقریباً تین ماہ رہی۔اس میں جنرل نواز صاحب، جنرل شیریں دل نیازی صاحب ظفر احسن محمود صاحب اور دو ایک دوست اور ہوتے۔مثنوی اور جاوید نامہ سے بات شروع ہوتی۔عربی زبان اور قرآنِ کریم پر گہری نظر پرویزؒ صاحب رکھتے تھے اس کا علم تو سالہا سال سے تھا۔لیکن جو ترجمہ اور تشریح انہوں نے کلامِ اقبال کی بیان کی ہم لوگ تو عش عش کر اٹھے۔فلسفہ اور تصوف کا ذکر چھیڑا، تو ارسطو سے لیکر آج تک شاید ہی کوئی کتاب ہو جو پرویزؒ صاحب کی لائبریری میں نہ ہو اور جس کا نچوڑ انہوں نے چند الفاظ میں نہ بیان کر دیا ہو۔علم و دانش کا وہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جس کا کوئی کنارہ نہ تھا۔کاش کہ ان محفلوں کی ریکارڈنگ بھی ہوجاتی۔بہرحال میرے اپنے پاس ذاتی نوٹس موجود ہیں جب بھی وقت ملے اُن کی ورق گردانی کرتا ہوں اور ماضی کے اُن حسین لمحات میں کھو جاتا ہوں۔ مجھے وہ لمحہ کبھی نہیں بھولے گا جب اقبالؒ کے ان اشعار پر پہنچے تو حاضرین کی حالت قابلِ دید تھی۔ میں تو ایک سکتہ کی سی کیفیت میں رہا کچھ سال بعد ''صادقین'' سے انہیں اشعار کی بہت خوبصورت خطاطی کروائی اور اپنے ڈرائنگ روم میں سجالیا۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
گر تُو می بینی حسابم ناگزیر
از نگاہ مصطفیٰؐ پنہاں بگیر

آخر میں محترم پرویزؒ صاحب کے متعلق اس سے زیادہ کیا لکھوں کہ اگر میری اُن سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو نہ جانے کن کن دشوار گزار، الٹے سیدھے راستوں اور پگڈنڈیوں پر ٹھوکریں کھاتا رہتا۔خدانخواستہ کہیں دینِ اسلام سے ہی برگشتہ نہ ہوجاتا یا پھر ایک متشدد قسم کا رجعت پسند مولوی بن جاتا لیکن اللہ کا شکر ہے کہ جس گوہرِ مقصود کی تلاش میں نے 1944ء میں شروع کی تھی وہ اچانک تقریباً آٹھ سال بعد مل گیا، ایک ہی نشست میں کائنات کا رنگ بدل گیا اور میرا دل و دماغ قرآنی فکر و نظر سے منور ہوگیا۔ یہ ہے میرا خراجِ تحسین اُس مفکرِ قرآن کے حضور۔



پرویز علیہ الرحمہ کا طلوعِ اسلام کنونشن سے خطاب کا ایک منظر



سامعین کنونشن کا خطاب، ہمہ تن گوش ہو کر سن رہے ہیں۔

علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خُمِ زندگی

پیام بہ یارانِ طریق

غزل سرای و نواہای رفتہ باز آور — بہ این فسردہ دلان حرف دل نواز آور
کنشت و کعبہ و بتخانہ و کلیسا را — ہزار فتنہ از آن چشم نیم باز آور

برادرانِ عزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ میں سے جو احباب سالِ گزشتہ 1956ء کی کنونشن میں شریک ہوئے تھے، انہیں وہ سماں اب تک یاد ہوگا جب آخری دن، تمام افرادِ کارواں، ایک دوسرے سے گلے مل کر رخصت ہو رہے تھے۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ فضا میں ہر طرف خلوص و محبت کی شمعیں فروزاں۔ ذہن گذشتہ تین دن کی شبانہ روز محفلوں کی کیف آور یاد سے فردوس بداماں، سینوں میں پاکیزہ جذبات کا تلاطم، قلوب میں حسین تمناؤں کا ہجوم، آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو اور لبوں پر سوز و گداز میں ڈوبا ہوا یہ الوداعی پیغام:

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد — ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا ❶

للہ الحمد! کہ ایک سال کے انتظار کے بعد، خمکدہ ءقرآن کے یہ پیمانہ بردار، اس عزم کے ساتھ پھر باعثِ گرمیءِ محفل اور وجہ نشاطِ انجمن ہوئے ہیں کہ ؎

بیا تا کار این امت بسازیم — قمار زندگی مردانہ بازیم
چنان نالیم اندر مسجد شہر — کہ دل در سینۂ ملا گدازیم ❷

قُلۡ بِفَضۡلِ اللّٰہِ وَبِرَحۡمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلۡیَفۡرَحُوۡا ؕ (10:58) میں اپنی طرف سے اور آپ تمام احباب کی طرف سے بزمِ طلوعِ اسلام راولپنڈی کے باہمت اور پُرخلوص کارکنوں کا سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے اس اجتماع کے انتظامات کو اپنے ذمہ لیکر، اس کاروانِ راہِ محبت و عزیمت کی دوسری منزل کو بھی (پہلی منزل کی طرح) آسان اور پُرآسائش بنا دیا۔

---

❶ ہجر اور وصال دونوں ہی کی اپنی اپنی جداگانہ لذتیں ہیں، (لہٰذا تُو اگر جاتا ہے تو) ہزار بار جا، اور (اگر اپنے وصل سے نوازتا ہے تو) لاکھ بار آجا۔

❷ آؤ، ہم اس اُمت کے معاملات درست کریں، زندگی کا کھیل مردانہ وار کھیلیں۔ شہر کی مسجد میں اس طرح سے نالہ و فریاد کریں، کہ ملّا کے سینہ میں جو (پتھر جیسا سخت) دل ہے، وہ بھی گداز ہو جائے۔

احتسابِ خویش:

برادرانِ گرامی قدر! اس قسم کے اجتماعات درحقیقت جماعتوں کی زندگی میں یوم الحساب (یعنی احتسابِ خویش کا دن) ہوتے ہیں۔ جس میں اس امر کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ ہم نے پچھلے اجتماع میں جس پروگرام کو اپنے سامنے رکھا تھا اُسے کس حد تک پورا کیا ہے اور اب اس کے بعد ہمارا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔ یاد رکھیے!

جو راہ رو، کسی مقام پر رُک کر یہ نہیں دیکھ لیتا کہ اس کا قدم صحیح راستے پر اُٹھ رہا ہے یا نہیں، اُسے منزلِ مقصود تک پہنچنے کا کبھی یقین نہیں ہوسکتا۔ جو کاروباری وقتاً فوقتاً اپنی متاع و بضاعت کا جائزہ نہیں لیتا اور نفع و نقصان کا اندازہ نہیں لگاتا، وہ کبھی حتم و یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی تمام تگ و تاز اور سعی و کاوش اسے کس سمت لے جارہی ہے۔ ان دو تین دنوں میں آپ کو بھی یہی کچھ کرنا ہوگا۔ لیکن جیسا کہ میں نے پچھلے سال بھی عرض کیا تھا، جو جماعت قرآنی نظامِ ربوبیت کی تشکیل کا عزم لے کر اٹھتی اور اپنے اللہ سے بیع و شریٰ کا معاملہ کرتی ہے، اس کے نفع اور نقصان کے ماپنے کے پیمانے اور اندازے دوسری جماعتوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ عام جماعتوں کو صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ انہوں نے کتنے ممبر بھرتی کئے، کسقدر روپیہ فراہم کیا۔ کتنے جلسے کئے، کتنے جلوس نکالے۔ مخالفین کو دبانے کے لئے کون کون سے حربے استعمال کئے اور اس طرح انتخابات میں کتنی نشستیں حاصل کیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن قرآنی نظام کی داعی جماعت کے افراد کو دیکھنا یہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے اندر کس قدر تبدیلی پیدا کی ہے۔

داخلی انقلاب:

ان کا قلب و دماغ کس حد تک قرآنی تصورات سے ہم آہنگ ہو چکا ہے۔ ان کی سیرت و کردار کہاں تک قرآنی قالب میں ڈھل چکے ہیں۔ ان کی آرزوؤں اور ارادوں کے محرکات کس حد تک قرآنی مقاصد ہیں۔ وہ اپنی ذات، اپنے اعزہ و اقارب اور دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملات میں قوانینِ خداوندی کی کس قدر نگہداشت کرتے ہیں۔ اگر ہمارے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوگی تو پھر آپ نے دوسرے معیاروں کے مطابق کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلی ہو، قرآن کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ لیکن اگر ہمارے کردار اور تصورات میں یہ انقلاب پیدا ہو چکا ہے تو یہ کامیابی بڑی کامیابی ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم اپنے مقصد کے حصول کے لئے خارجی اسباب و ذرائع اور طریق و رفیق سے بے نیاز ہیں اور ان کی طرف توجہ دینے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ قرآن میں اس ساز و یراق کی تاکید استطاعت فراہمی کی تاکید کرتا ہے وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ۔۔۔ (8:60) اس لئے حصولِ مقصد کے لئے اسباب و ذرائع کا ہونا بھی ضروری ہے۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر ہم میں وہ داخلی تبدیلی پیدا ہو جائے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے تو خارجی اسباب و ذرائع کی کسی حد تک کمی کے باوجود ہم کامیاب و کامران کہلائیں گے۔ اور خدا کا کائناتی قانون ہماری مدافعت میں کھڑا ہو کر معترضین اور مخالفین سے کہہ دے گا۔

بہ چشمِ کم منگر عاشقانِ صادق را کہ ایں شکستہ بہایاں متاعِ قافلہ اند ❶

لیکن اگر ہم اس داخلی انقلاب کے بغیر صرف خارجی سہاروں کے زور پر آگے بڑھنا چاہیں گے تو وہی قانون ہمیں یہ کہہ کر دھتکار دے گا کہ

بہ جہانِ دردمنداں تو بگوچہ کار داری تب وتابِ ما شناسی؟ دلِ بے قرار داری
چہ خبر ترا ز اشکے کہ فرو چکد زچشمے تو بہ برگِ گل زشبنم دُر شاہوار داری ❷

اور یہ ظاہر ہے کہ جو اُس بارگاہ سے دھتکارے جائیں، انہیں کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔

وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿٧٤﴾ (9:74)

داخلی انقلاب پیدا کیسے ہو؟

مجھ سے اکثر کہا جاتا ہے کہ قرآنی فکر اور نظام کے متعلق بات تو ہم سمجھ گئے ہیں لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ داخلی تبدیلی پیدا کس طرح سے ہوتی ہے؟ ایک لفظ میں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ پیدا ہوتی ہے ایمان سے۔ لیکن تجربہ نے بتایا ہے کہ فقط اتنا کہہ دینے سے بات سمجھ میں نہیں آتی، مسئلہ حل نہیں ہوتا، گتھی سلجھتی نہیں۔ اس لئے ہم میں سے ہر شخص اس کا مدعی ہے (اور وہ پوری دیانتداری سے ایسا سمجھتا ہے) کہ وہ صاحبِ ایمان ہے، لیکن اس کے باوجود اُس کے اندر یہ تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں کہ ایمان کہتے کسے ہیں؟ اگر سمجھ لیا جائے تو ہو نہیں سکتا کہ ایمان پیدا ہو اور داخلی تبدیلی پیدا نہ ہو یا یہ تبدیلی پیدا نہ ہو اور اس کے باوجود ہم اپنے آپ کو اطمینان دے لیں کہ ہم صاحبِ ایمان ہیں۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ فرض کیجئے کہ آپ کو دو تین دن کا فاقہ ہے آپ بھوک سے نڈھال ہو رہے ہیں، اتنے میں ایک شخص آپ کے سامنے گرم گرم پلاؤ کا قاب لا کر رکھ دیتا ہے۔ اس کی خوشبو سے آپ کی جان میں جان آ جاتی ہے۔ آپ اس کی طرف لپکتے ہیں۔ نہایت بیتابی سے نوالہ اٹھاتے ہیں۔ آپ کا ہاتھ منہ کے قریب جاتا ہے کہ اتنے میں وہ شخص کہہ دیتا ہے کہ اس پلاؤ میں ویسے تو ہر چیز خالص اور عمدہ ہے لیکن باورچی نے غلطی سے اس میں نمک کی جگہ سنکھیا (زہر) ڈال دیا ہے۔ آپ کہئے کہ یہ سن کر آپ اُس لقمہ کو منہ میں ڈالیں گے یا زمین پر پھینک دیں گے؟ ظاہر ہے کہ آپ بھوک سے لاکھ بیتاب ہوں، اس قاب میں سے ایک دانہ بھی چکھنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ آپ کی طبیعت اِس سے کیوں اِبا کرتی ہے؟ ابھی آپ اس کی طرف لپکے تھے، پھر آپ کے اندر یکا یک یہ تبدیلی کیسے پیدا ہو گئی کہ آپ اُس سے یوں بھاگنے لگے؟ محض اس لئے کہ آپ کو اس کا یقین ہے کہ اس سے آپ کی موت واقع ہو جائے گی۔

ایمان کسے کہتے ہیں؟

اسے، برادران! ایمان کہتے ہیں۔ اب سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اگر یہ کہنے کی بجائے کہ اُس پلاؤ میں سنکھیا پڑا ہے، یہ کہہ

---

❶ ان عاشقانِ صادق کو نیچی نظر سے نہ دیکھ، کہ یہ (بظاہر) کم قیمت والے کاروانِ (انسانیت) کا سرمایہ ہیں۔

❷ دردمندوں کے جہان سے بھلا آپ کا کیا واسطہ؟ کیا آپ ہماری تب وتاب کو پہچانتے ہیں کیا آپ دل بے قرار رکھتے ہیں؟ آپ کو ان آنسوؤں کی کیا خبر جو کسی کی آنکھ سے ٹپکتے ہیں۔ کیا آپ کے ہاں بھی برگ گل پر شبنم کا قیمتی موتی نظر آتا ہے؟

دیا جاتا کہ وہ مالِ حرام سے تیار ہوا ہے، تو کیا اس وقت بھی ہماری طبیعت کا ردّعمل ایسا ہی ہوتا؟ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ یہ کیوں؟ اس لے کہ اس پر تو ہمارا ایمان ہے کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے لیکن اس پر ہمارا ایمان نہیں کہ مالِ حرام بھی مہلک ہوتا ہے۔ اگر اس پر بھی ہمارا ویسا ہی یقین ہوتا جیسا کہ سنکھیا کے متعلق ہے تو ہو نہیں سکتا تھا کہ اس کے خلاف ہمارا وہ ردعمل نہ ہوتا جو سنکھیا کے خلاف ہوا تھا۔ اس مثال کو سامنے رکھیئے اور پھر سوچئے برادران! کہ کیا قرآنی اقدار پر ہمارا ایمان ایسا ہے کہ ہمیں یقین ہ کہ ان کی خلاف ورزی سے ہماری انسانیت کی اُسی طرح موت واقع ہو جائے گی؟ اگر ان اقدار کے متعلق ہمارا اس قسم کا ایمان نہیں تو پھر ہم میں وہ داخلی تبدیلی کیسے پیدا ہو سکتی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے؟ اور اگر ان پر ایمان ہے تو پھر ہو نہیں سکتا کہ اس کے بعد ہمارے اندر یہ انقلاب پیدا نہ ہو جائے۔

ایمان کیسے پیدا ہو؟

اس پر یہ پوچھا جاتا ہے کہ قرآنی اقدار کے متعلق اس قسم کا ایمان کیسے پیدا ہو؟ اس کے لئے پہلے یہ سمجھئے کہ سنکھیا کے متعلق اس قسم کا ایمان کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اس کی حسبِ ذیل شکلیں ہو سکتی ہیں:

(1) ہم نے سنکھیا کھانے والے کو خود مرتے دیکھا ہو۔

(2) یا ہم خود، ایک ڈاکٹر یا سائنٹسٹ کی طرح لیبارٹری میں سنکھیا کا تجزیہ کر کے علمی طور پر اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ یہ واقعی قاطعِ حیات ہے۔

(3) اگر ہم خود اتنی مشقت نہیں اٹھانا چاہتے تو کسی ایسے محقق سے سمجھ لیں جس نے اس قسم کا تجزیہ کیا ہو۔

(4) اور اگر اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو پھر اُس کی بات پر ویسے ہی یقین کر لیں جیسے ہم طب کی کتابوں میں پڑھ کر کہ فلاں چیز مضر ہے، اُس کے مضر ہونے پر یقین کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد تجربہ ہمیں خود بتا دے گا کہ کہنے والے نے سچ کہا تھا یا نہیں۔

اس نتیجہ تک پہنچنے کے لئے کہ سنکھیا قاطع زندگی ہے یہی طریقے ممکن ہو سکتے ہیں۔ اب آپ طبعی زندگی سے انسانی ذات کی طرف آیئے۔

یہ ظاہر ہے کہ انسانیت (یا انسانی ذات) کی ہلاکت، جسمانی موت کی طرح محسوس شکل میں ہمارے سامنے نہیں آ سکتی۔ اس لئے اس کے متعلق آنکھوں سے دیکھ کر یقین حاصل کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ دوسری صورت خود تحقیق کرنے کی ہے۔ سو ہم میں سے کتنے ہیں جو اس کوہ کنی کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینے کے لئے آمادہ ہو سکتے ہیں؟

تیسری شکل یہ ہے کہ ہم کسی سمجھے ہوئے سے سمجھ کر اپنا اطمینان کر لیں۔ اسے افہام و تفہیم کا طریق یا فکری انداز کہا جاتا ہے۔ یقین اور ایمان پیدا کرنے کا یہ فکری طریق وہ ہے جس کی قرآن میں اس قدر تاکید آئی ہے۔ اس موضوع پر طلوع اسلام اور میری تصانیف میں اتنا کچھ آپ کے سامنے آ چکا ہے کہ میرے خیال میں اس وقت اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت ہیں۔ البتہ یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس طریقِ کار سے نہ کسی عقل و فکر کو ماؤف کر کے حقیقت کو منوایا جاتا ہے اور نہ ہی جور

واستبداد سے اُسے اس کے ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ (2:256) کے یہی معنی ہیں۔

ایمان خود پیدا کیا جاتا ہے:

یہی ہے برادران! وہ طریقِ عمل جس سے آپ کے دل میں بھی ایمان پیدا ہوسکتا ہے۔ لیکن اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ایمان کوئی ایسی چیز نہیں جسے کوئی دوسرا شخص آپ کے دل میں پیدا کرسکتا ہے۔ دوسرا شخص زیادہ سے زیادہ آپ کو حقیقت سے آگاہ کرسکتا اور جس بات کا آپ کو علم نہ ہو اسے آپ کو سمجھا سکتا ہے۔ آپ کے اندر ایمان داخل نہیں کرسکتا، خواہ وہ کتنا ہی کیوں نہ چاہے۔ اور تو اور خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآن میں ہے کہ: اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ (28:56) تو کسی شخص کو راستہ پر لگا نہیں سکتا خواہ تو کتنا ہی کیوں نہ چاہے۔ راستہ پر وہی لگ سکتا ہے جو اللہ کے قانون کے مطابق اس پر خود لگنا چاہے اور اللہ کا وہ قانون یہ ہے کہ جو شخص تفقہ اور تدبر سے کام نہیں لیتا اور یوں زندگی کے صحیح راستے سے پھر جانا چاہتا ہے، اُسے اُس راستے سے پھیرا دیا جاتا ہے۔ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ (9:127) آپ نے غور کیا برادران! کہ صحیح راستہ پر چلنے (یعنی ایمان اور ایمان کی رُو سے اپنے اندر ''داخلی انقلاب'' پیدا کرنے کے لئے تدبر و تفکر کی شرط کس قدر بنیادی ہے؟ اس سے ظاہر ہے کہ جس شخص کے دل میں اس قسم کا ایمان پیدا نہ ہو، اُسے جان لینا چاہئے کہ یا تو وہ اس حقیقت کو سمجھا نہیں کہ قرآنی اقدار کے خلاف زندگی بسر کرنے سے ہلاکت یقینی ہے اور اگر اس نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے (اور اس کے باوجود وہ ایمان پیدا نہیں ہوا) تو وہ شخص ہلاکت سے محفوظ رہنا نہیں چاہتا۔ ایسے شخص کے لئے حقیقت کا سمجھنا اور نہ سمجھنا برابر ہے۔ جو شخص زندگی کو اہمیت نہیں دیتا اس کے لئے یکساں ہے کہ اسے یہ بتایا جائے یا نہ بتایا جائے کہ کھانا زہر آلود ہے۔ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾ (2:6) یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ابتدا ہی میں کہہ دیا ہے کہ یہ ضابطہء ہدایت صرف ان لوگوں کی راہنمائی کرسکتا ہے جو زندگی کی ہلاکتوں سے محفوظ رہنا چاہیں۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۲﴾ (2:2) نبی اکرم ﷺ نے تعلیمِ کتاب وحکمت سے زندگی کی ان دونوں راہوں کو واضح کرکے بتا دیا اور اچھی طرح سمجھا دیا۔ جن لوگوں نے اسے سمجھ لیا اور سمجھ لینے کے بعد فیصلہ کرلیا کہ انہیں ہلاکت سے بچنا ہے، اُن کے اندر ایمان اس انداز سے پیدا ہوا کہ دنیا کی سخت سے سخت تکلیف یا بڑے سے بڑا لالچ انہیں اس راستے سے ہٹا کر دوسرے راستے پر چلنے کے لئے آمادہ یا مجبور نہ کرسکا۔ اور یہ چیز بالکل بدیہی اور فطری ہے۔ جو شخص موت سے بچنا چاہتا ہے، وہ زہر آلود کھانے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کے لئے تیار نہ ہوگا خواہ اس کی چمڑی تک بھی کیوں نہ ادھیڑ دی جائے یا دولت کے انبار اس کے سامنے کیوں نہ رکھ دیئے جائیں۔ اس کی زبان سے کوڑے کی ہر ضرب کے ساتھ (حضرت) بلالؓ کی طرح یہی نکلے گا کہ: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور زر و سیم کی ہر پیشکش کو نگہ استحقار سے ٹھکراتے ہوئے وہ (حضور رسالتمآب ﷺ کی اتباع میں) بلا توقف کہہ دے گا کہ اگر میرے ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند رکھ دیا جائے تو بھی میں اپنے اس طریق سے نہیں ہٹوں گا۔ اس لئے کہ: قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ

عَظِیْمٍ ①۵ (6:15) میں جانتا ہوں کہ اس راستے سے ہٹنے کا نام ہلاکت اور تباہی ہے۔

یہ ہے برادران! وہ علی وجہ البصیرت ایمان جو انسان کے اندر ایسا انقلاب پیدا کر دیتا ہے جس سے اُس کی نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے، اقدار کی نوعیت بدل جاتی ہے، زندگی کے راستے بدل جاتے ہیں، حیات کے تصورات بدل جاتے ہیں، مقصود بدل جاتا ہے منتہی بدل جاتا ہے اور (قرآن کے الفاظ میں) یہ زمین بدل جاتی ہے، آسمان بدل جاتا ہے اور اس دنیائے کہن کی جگہ ایک جہانِ تازہ اپنی پوری زیبائیوں اور رعنائیوں کے ساتھ منصۂ شہود پر آ جاتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اس سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی ہوگی کہ قرآن زندگی کی ساری عمارت کو ایمان کی بنیادوں پر کیوں استوار کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے بغیر اُس عمارت کی کوئی اینٹ بھی صحیح رُخ پر نہیں رکھی جا سکتی۔ نہ ہی اس کے بغیر انسان کے سینے میں کردار کا جوش اور عمل کا ولولہ بیدار ہو سکتا ہے۔ یہ ایمان ہی کا کرشمہ ہے کہ جس سے انسان کے سر میں وہ سودا پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ۔۔ کبھی یورپ کے کلیساؤں میں اور۔۔ کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں یہ کہہ کر اذانیں دیتا پھرتا ہے کہ

بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم غزل سرایم و پیغام آشنا گویم ❶

اس ایمان سے ان کے دل میں وہ قوت (سلطان) پیدا ہو جاتی ہے جس سے یہ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (55:33) سے بھی آگے چلا جاتا ہے۔

جب اس انگارہء خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

لہٰذا برادران! اگر کوئی اس کی شکایت کرتا ہے کہ اُس کے سر میں یہ سودا کیوں نہیں پیدا ہوتا اور اُس کے دل میں اس تپش و خلش اور سوز و گداز کی نمود کیوں نہیں ہوتی۔ اُس کی خاکستر سے ایسا شعلہء بے باک کیوں نہیں اُٹھتا اور اُس کی آرزوئیں عمیق اور ہمتیں بلند کیوں نہیں ہوتیں، تو اس سے کہو کہ

یقیں پیدا کر اے غافل! کہ مغلوبِ گماں تو ہے

.....☆☆☆.....

دینِ خداوندی:

اب میں برادران! ایک اور گوشے کی طرف آنا چاہتا ہوں۔ سورہء آلِ عمران میں ہے: اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ کیا یہ لوگ نظامِ خداوندی کے علاوہ کوئی اور نظام اختیار کرنا چاہتے ہیں؟ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا

❶ میں اس بہانہ سے اس بزم (خطۂ ہند) میں کوئی محرم تلاش کرتا ہوں، غزل گاتا ہوں اور دوست کا پیغام پہنچاتا ہوں۔

وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ۝۸۳ (3:83) حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کوئی بھی ہے وہ خدا کے قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہے۔ اور اُن کا ہر قدم اُسی کی طرف اُٹھ رہا ہے۔ اس آیہء جلیلہ میں ایک عظیم حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ کائنات کی ہر شے (انسانوں سمیت) قانون خداوندی کے سامنے جھکتی ہے (19:93) جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے، وہ اس قانون کے سامنے طوعاً (بطیب خاطر) سجدہ ریز ہے۔ چنانچہ سورہ حم میں ہے: ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ (زمین کی تخلیق و تحسین کے بعد) خدا نے فضائی کروں کی طرف توجہ دی۔ اور وہ اُس وقت ہنوز گیس کی حالت میں تھے۔ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ اس نے زمین اور آسمان سے کہا کہ تم طَوْعًا آؤ یا کَرْهًا تمہیں اس طرف بہرحال آنا ہوگا۔ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ۝۱۱ (41:11) ان دونوں نے کہا کہ کَرْهًا کیوں؟ ہم بہ طیبِ خاطر ادھر آتے ہیں۔

طَوْعًا اَوْ كَرْهًا

اب رہے انسان، سو ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو قانون خداوندی کو طَوْعًا (بہ طیبِ خاطر) دل کی پوری رضامندی سے اختیار کر لیتا ہے لیکن دوسرا گروہ وہ ہے جسے اس کے سامنے کَرْهًا جھکنا پڑتا ہے۔ یعنی خدا کا کائناتی قانون (کہ جسے عام طور پر زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے) اُنہیں اس کے تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ قرن اول کی جماعتِ مومنین نے قرآنی نظام کو بطیبِ خاطر قبول کیا ہے، اور چند دنوں کے اندر اندر دنیا میں ایسا انقلاب برپا کر دیا جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے اُس سے قبل نہیں دیکھی تھی۔ بعد میں آنے والوں نے اس ضابطہء خداوندی کو چھوڑ کر، انسانوں کے خود ساختہ قوانین وضوابط کی اطاعت اختیار کر لی اور رفتہ رفتہ ان کی کیفیت یہ ہوگئی کہ: وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ (39:45) جب اُن لوگوں سے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے کہا جاتا ہے کہ وہ (انسانوں کے خود ساختہ منہاج و مسلک کو چھوڑ کر) صرف قانونِ خداوندی کی اطاعت اختیار کریں تو ان کے قلوب غم و غصہ سے طلسمِ پیچ و تاب بن جاتے ہیں وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا۝۴۶ و (17:46) وہ نفرت و انتقام کے جذبات سے مغلوب ہو کر منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ مُعْرِضِيْنَ۝۴۹ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ۝۵۰ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ۝۵۱ (51-74:49) جیسے بدکا ہوا گدھا شیر سے ڈر کر بھاگ اٹھتا ہے کہ وہ کہیں اُسے کھا نہ جائے۔ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ۝۴۵ (39:45) لیکن جب خدا کے سوا، اوروں کا نام لیا جاتا ہے تو خوشی سے ان کی باچھیں کِھل جاتی ہیں۔ اس ہزار سال میں قرآن کے متعلق جو ہمارا طرزِ عمل رہا ہے، ان آیات میں اس کی صحیح صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے۔

قرآن سے بُعد و مغائرت:

جس گوشے سے سنیے، اس قسم کی آوازیں سنائی دیں گی کہ ''تنہا قرآن سے دین کی تکمیل نہیں ہوتی'' (حالانکہ قرآن بھیجنے والے کا اعلان ہے کہ: مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (6:38) دین کے متعلق کوئی بات ایسی نہیں جس کی اس

کتاب میں کمی ہو۔ ''یہ کتاب مبہم ہے'' (حالانکہ اس نے اپنے آپ کو کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ۙ(27:1) کہا ہے۔ ''غیر واضح ہے'' حالانکہ اس کا دعویٰ ہے کہ: کِتٰبٌ فُصِّلَتۡ اٰیٰتُہٗ (41:3) یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات کو نکھار کر، الگ الگ کر کے، بیان کیا گیا ہے۔) ''ناقابلِ فہم ہے'' (حالانکہ خدا نے کہا ہے کہ: وَلَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ (54:17) اور حقیقت ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنایا ہے۔ ''غیر قرآنی فیصلے اس کے احکام کو منسوخ کر سکتے ہیں'' (حالانکہ اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ: وَلَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ ۚ (6:34) (احکامِ خداوندی کو کوئی بدلنے والا نہیں) غرضیکہ کوئی تہمت ایسی نہیں جس سے ہم نے اس کتابِ عظیم و جلیل کو متہم نہ کیا ہو اور کوئی حربہ ایسا نہیں جسے ہم نے، لوگوں کو اس سے دور رکھنے کے لئے اختیار نہ کیا ہو۔ ماضی کی سرگزشت سے قطع نظر، خود ہمارے زمانے میں مسلمانوں کی طرف سے قرآن کی آواز کی جس قدر مخالفت ہو رہی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ وہ کون سی تدبیر ہے جو اس کی آواز کو دبانے کی خاطر نہیں کی جاتی؟ وہ کون سا جھوٹ ہے جو اس ''ثوابِ عظیم'' کے لئے نہیں بولا جاتا؟ وہ کون سا بہتان ہے جو اس ''جہادِ اکبر'' کے لئے تراشا نہیں جاتا؟ لیکن اس کے باوجود، برادران! آپ دیکھئے کہ وہ جو قرآن نے کہا تھا کہ جو لوگ خدا کے قانون کے سامنے طوعاً نہیں جھکتے انہیں اس کے حضور کرھاً جھکنا پڑے گا، وہ کس قدر صحیح ہے۔

مجبوراً جھکنا پڑتا ہے:

ابھی دو چار سال ادھر کی بات ہے یہ آواز بلند کی گئی کہ رزق کے سرچشمے انفرادی ملکیت کے بجائے نظامِ خداوندی کی تحویل میں رہنے چاہئیں تاکہ وہ نوعِ انسانی کی عام پرورش کا ذریعہ بن سکیں تو اس کے خلاف چاروں طرف سے مخالفتوں کا طوفان اس تلاطم انگیزی سے اُبھرا گویا یَکَادُوۡنَ یَسۡطُوۡنَ بِالَّذِیۡنَ یَتۡلُوۡنَ عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا ؕ (22:72) وہ اس قانونِ خداوندی کو پیش کرنیوالوں پر جھپٹ پڑیں گے۔ لیکن اب انہی مخالفین کو زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر یہ کہنا پڑا ہے کہ

> میرے خیال میں اس بارے میں پہلے گروہ (یعنی قدامت پسند طبقہ) کو بھی کوئی اختلاف نہیں ہوگا کہ بنیادی ضروریات پیدا کرنے والے ذرائع و عاملین کو کم از کم موجودہ حالت میں کچھ دنوں تک حکومت کے قانون ہاتھوں میں رہنا چاہئے جس کی گنجائش کتاب و سنت میں موجود ہے۔
>
> (مجلہ رحیق [1]، بابت جون 1957ء)

یعنی طلوعِ اسلام تو پھر بھی ان ذرائع کو قرآنی نظام کے ہاتھ میں دینے کی تجویز کرتا تھا، یہ حضرات انہیں موجودہ حکومت کے قانونی ہاتھ میں دینے کی گنجائش کتاب و سنت میں پا رہے ہیں۔ آپ نے چیلنج ملاحظہ فرمایا؟

یا مثلاً جب طلوعِ اسلام کی طرف سے اس حقیقت کا اعلان ہوا کہ قرآن کی رُو سے سرمایہ داری اور زمینداری کا نظام قطعاً باطل ہے تو قدامت پسند طبقہ کی طرف سے ہنگامہ برپا کر دیا گیا کہ یہ کمیونزم ہے، دہریت ہے۔ دین میں فتنہ انگیزی ہے۔ چنانچہ اس کے

---

[1] یہ جماعت اہلحدیث کا آرگن تھا

خلاف تقریریں کی گئیں، کتابیں لکھی گئیں، پمفلٹ شائع کئے گئے۔ انہی حضرات کو اس قانونِ خداوندی کے سامنے کس طرح کرھا جُھکنا پڑا ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ انہوں نے حال ہی میں اپنی ایک کانفرنس میں حسب ذیل ریزولیوشن پاس کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی ہر چیز انسان کے لئے پیدا کی ہے اور اصل قدر و قیمت سرمایہ کی نہیں انسان کی ہے۔ اس لئے ایک اسلامی مملکت میں ملک کی دولت اور کاروبار کو عام شہریوں کی ترقی اور خدمت کے لئے وقف ہونا چاہئے۔ رائج الوقت نظام نے اس دنیا کے تمام ذرائع معاش پر ایک محدود گروہ کا تسلط قائم کر دیا ہے اور سرمایہ کو انسان کا خدا بنا رکھا ہے۔ اس لئے ملک کی تمام دولت اور کاروبار اس مخصوص گروہ کی اجارہ داری بن چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ صورتِ حال سراسر ظالمانہ ہے اور ہم اسے ایک ایسے نظام میں بدل دینا چاہتے ہیں جس میں ملک کی دولت اور کاروبار پر اجارہ داری ختم ہو جائے اور عوام کو رزق حاصل کرنے اور دولت کے ذرائع سے فائدہ اٹھانے کے مساوی مواقع حاصل ہوں۔ اس نظریہ کو بروئے کار لانے کے لئے جماعتِ اسلامی موجودہ معاشی نظام میں حسب ذیل تبدیلیاں چاہتی ہے (1) بڑی بڑی ملکیتوں اور دولت کے ذخیروں کو اسلامی قانون کے مطابق عوام میں پھیلانے کا کام بلا تاخیر کیا جائے۔

(جماعت اسلامی کی لیبر کانفرنس میں پاس شدہ ریزولیوشن بحوالہ انجام کراچی بابت 28 جولائی 1958ء)

یا مثلاً جب طلوع اسلام نے کہا کہ اسلام میں فرقہ بندی شرک ہے اور امت میں اختلاف خدا کا عذاب، تو ایک ہنگامہ برپا کر دیا گیا کہ یہ حدیث کا انکار ہے۔ سنتِ نبوی کی مخالفت ہے کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ **اختلاف امتی رحمۃ**۔ لیکن اب حدیث کے سب سے بڑے متبعین کی طرف سے اعلان ہو رہا ہے کہ **اختلاف امتی رحمۃ** کا جملہ بالکل بے اصل اور غیر مستند ہے اور قطعاً اس لائق نہیں کہ اس کو حدیث سمجھ کر دلیل و برہان کے طور پر استعمال کیا جائے۔

(الاعتصام ❶ 'بابت 2 اگست 1957ء)

للہ الحمد ۔۔۔ حوریاں رقص کناں سجدہ ءشکرانہ زنند

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے سابقہ کنونشن میں کہا تھا کہ طلوع اسلام کی آواز کا اثر یہ ہے کہ اس کے مخالفین خود طلوع اسلام کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں، ان کی تحریر و تقریریں اس کے الفاظ و اصطلاحات بلا تکلف استعمال ہوتے ہیں حتی کہ وہ قرآن کی آیات کا ترجمہ بھی اسی کے اسلوب و انداز میں کرتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے کہا تھا کہ ؎

یہاں تک تو لگا لائے ہیں ہم رستے پہ واعظ کو کہ سمجھاتا ہوا اب تا در میخانہ آتا ہے

لیکن اس ایک سال میں ''واعظ'' کے مشرب میں جس قدر نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی ہے اور جس کی کچھ مثالیں میں نے ابھی ابھی پیش کی ہیں، اس کے پیشِ نظر میرا خیال ہے کہ اب ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہنا چاہئے کہ ؎

سنا ہے شیخ نے بھی بیعتِ پیر مغاں کر لی غنیمت ہے کہ بھولا صبح کا ہنگامِ شام آیا

❶ یہ بھی جماعت اہلحدیث کا آرگن تھا۔

اور مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب پیر میخانہ نو وارد توبہ شکنوں کا تعارف کچھ اس قسم کے الفاظ سے کرائے کہ ؎

شریفِ مکہ رہا ہے کئی برس اے شیخ یہ میرؔ اب جو گدا ہے شراب خانے کا

وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿19﴾ (33:19)

حقیقت یہ ہے برادرانِ عزیز! (اور میں اسے بحضور رب العزت جھکی ہوئی نگاہوں، لرزتے ہوئے ہونٹوں اور ڈبڈبائی آنکھوں سے بطور تحدیثِ نعمت عرض کرتا ہوں نہ بہ غرضِ فخر و مباہات) کہ اس مختصر سے عرصہ میں قرآنی تصوراتِ زندگی اور نظریاتِ حیات کی شمع نورانی پر مدتوں سے پڑے ہوئے پردے، جس تیزی سے اُٹھتے چلے گئے ہیں، ہم اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ شاید نہ لگا سکیں، کیونکہ یہ روشنی ہماری آنکھوں کے بہت زیادہ قریب ہے لیکن آنے والی نسلیں جب اس دور پر نگہ بازگشت ڈالیں گی تو وہ فکر و نظر کے اس انقلاب کا صحیح صحیح اندازہ لگا سکیں گی۔

دعا دینگے مرے بعد آنے والے میری وحشت کو بہت کانٹے نکل آئے ہیں میرے ساتھ منزل کے

.....☆☆☆☆☆.....

لاء کمیشن

قرآنی فکر کی اس مخالفت کی ایک بین مثال وہ شور و شغب ہے جو لاء کمیشن [1] میں میری شمولیت پر مچایا گیا کہ (جیسا کہ طلوع اسلام کی اشاعت بابت اکتوبر 1957ء میں بتایا گیا ہے) کمیشن میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے متعلق ان مخالفت کرنے والوں کا فتویٰ یہ ہے کہ وہ قرآن تک کے منکر ہیں۔ (واضح رہے کہ میں کمیشن کے اراکین کے متعلق کسی قسم کا اظہار خیال نہیں کر رہا۔ صرف ان مخالفین کے الزامات کو دہرا رہا ہوں)۔ اس میں ایسے لوگ بھی ہیں (یعنی میرے علاوہ) جن کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ وہ منکرِ حدیث ہیں۔ لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان لوگوں کا نام تو محض ایک آدھ مرتبہ لیا گیا اور وہ بھی برائے وزن بیت۔ لیکن مخالفت کے طوفان کا سارا رخ ''خانہ انوری'' (یعنی اس خاکسار کی طرف) کی طرف رہا۔ یہاں تک کہ اس کمیشن کا نام ہی انہوں نے ''پرویزی کمیشن'' رکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ مخالفت اس اصول پر مبنی ہوتی کہ کمیشن میں ایسے لوگوں کو کیوں شامل کیا گیا ہے جو (بقول ان کے) قرآن یا حدیث کے منکر ہیں تو ان تمام اراکین کی (جن کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے) یکساں مخالفت ہونی چاہئے تھی۔ لیکن ان سب کو چھوڑ کر تمام تیروں کا نشانہ جو صرف ایک کو بنا لیا گیا تو یہ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ اس مخالفت کی بنیاد حدیث کی محبت نہیں کچھ اور ہے۔ میرا جرم یہ ہے کہ میں انسانی زندگی کے معاملات کے تصفیہ کے لئے اللہ کی کتاب کو سب سے اوپر رکھتا ہوں اور صحیح اور غلط کا معیار اسی کو قرار دیتا ہوں۔ حدیث کے متعلق جو میرا مسلک ہے میں نے اس کی وضاحت سال گذشتہ کی کنونشن کے خطاب میں ان الفاظ میں کر دی تھی۔

---

[1] دستورِ پاکستان 1956ء کے تحت حکومت نے ایک اسلامک لاء کمیشن متعین کیا تھا جس میں پرویز صاحب کو بھی ایک رکن کی حیثیت سے منتخب کیا گیا تھا۔ 1958ء میں اس دستور کی تنسیخ کے ساتھ یہ کمیشن بھی کالعدم قرار پا گیا۔ (طلوعِ اسلام)

''جو روایات نہ قرآن کے خلاف ہیں اور نہ ہی ان سے حضور ﷺ کی سیرتِ مقدسہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہے انہیں ہم صحیح مانتے ہیں۔ (بادۂ زندگی)''

اگر ایسا عقیدہ رکھنے والے کو منکرِ حدیث کہا جاتا ہے تو پھر معاف رکھیے۔

نہ من تنہا دریں مے خانہ مستم جنید و شبلی و عطار ہم مست ❶

اس صورت میں اس الزام سے تو کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔ باقی رہی حدیث کی قانونی حیثیت سو اس کے متعلق میں نے دوسرے مقام پر تفصیل ❷ سے گفتگو کی ہے جس کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔

اس مخالفت کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ لاء کمیشن کا فریضہ صرف اتنا ہے کہ مروجہ قوانین کو ''کتاب وسنت'' کے مطابق مدون کرنے کی سفارشات کرے۔ یعنی اس کا کام صرف سفارش کرنا ہے، اس سے زیادہ اسے کوئی اختیارات حاصل نہیں۔ کمیشن کی یہ سفارشات مجلس قانون ساز (لیجسلیٹو اسمبلی) کے سامنے پیش ہوں گی جو انہیں قانونی حیثیت دینے یا نہ دینے کا فیصلہ کرے گی۔ یعنی اس مجلس کو قانون سازی کا اختیار ہوگا۔ یہ کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اُس مجلس (یعنی لیجسلیٹو اسمبلی) میں اُس آئین کی رو سے جسے یہ حضرات اسلامی آئین قرار دے چکے ہیں، یا کم از کم اسے تسلیم کر چکے ہیں۔۔ مسلمان ممبروں کے دوش بدوش غیر مسلم ممبرز (یعنی ہندو اور عیسائی) بھی موجود ہیں اور انہیں اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے کہ کون سا قانون کتاب وسنت کے مطابق ہے اور کونسا نہیں ووٹ دینے کا برابر حق حاصل ہے۔ اب آپ سوچئے کہ جس مجلس نے اسلامی قوانین کے متعلق آخری فیصلہ کرنا ہے اس میں غیر مسلموں کی شرکت تو ان ''حامیانِ دینِ متین'' کے نزدیک قطعاً قابلِ اعتراض نہیں، لیکن اس کمیشن میں جس کا کام صرف سفارش کرنا ہے ایک ایسے مسلمان کی شرکت جو روایات کے بارے میں ان کا ہمنوا نہیں، ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ اور ان کا طرزِ عمل اس شخص کے متعلق جو آج تک یہ پکارتا چلا آ رہا ہے کہ جس مجلسِ قانون ساز میں غیر مسلم بھی ہوں وہ قطعاً اسلامی نہیں کہلا سکتی۔

مخالفت کی وجہ:

لیکن برادران! پیغامِ خداوندی کی یہ مخالفت کوئی نئی چیز نہیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ شروع سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿34:34﴾ یہ تاریخ کی بین حقیقت ہے کہ دنیا کی کسی قوم کی طرف خدائی دعوت کا پہنچانے والا کوئی ایسا نہیں آیا جس کی مخالفت اس قوم کے مترفین کی طرف سے یہ کہہ کر نہ ہوئی ہو کہ ہم اس دعوت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اُن کی اس مخالفت کی وجہ کیا تھی، اس کے متعلق تاریخ کی شہادت قابلِ غور ہے۔ جہاں تک انبیاء علیہم السلام سابقہ کا تعلق ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں اس مخالفت کی شدت اپنی انتہاء تک پہنچ گئی تھی۔ مخالفت کا یہ طوفان ہیکل کے متولی اور یہودی شریعت کے علمبردار علماء اور مشائخ (احبار ورہبان) کی

---

❶ میں اس میخانہ میں اکیلا نہیں مست، جنید شبلی اور عطار بھی مست تھے۔

❷ ملاحظہ ہو ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب ''اسلام میں قانون سازی کا اصول'' (طلوعِ اسلام)

طرف سے برپا کیا گیا تھا جوان کے قتل تک کے درپے ہو گئے تھے۔ وہ آپ کے اس قدر شدید دشمن کیوں تھے، اس کی وجہ اور تفصیل حضرت مسیحؑ کے ایک حواری، جناب برنباس نے اپنی انجیل کی فصل 142 میں ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے! یہ ہم پر بڑی مصیبت ہو گی۔ اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقہ کے مطابق اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ اس وقت تو یہ ہماری تقالید (رسومات) کو باطل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا (لیکن جب اسے حکومت حاصل ہو گئی) تو اس کے ماتحت ہمارا انجام کیا ہو گا؟ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ اُس وقت ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے اور ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں حالانکہ اس وقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی بابت کچھ پروا کرنے والے نہیں اور اسی سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں وہ کر لیں۔ پس اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے۔ قربانی اور روزے کے ساتھ اُسے راضی کر لینا ممکن ہے، مگر جب کہ یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ راضی کیا جا سکے گا جب تک یہ اللہ کی اطاعت ایسے ہی ہوتے نہ دیکھے جیسی کہ موسیٰ علیہ السلام نے لکھی ہے۔

یعنی ساری بات یہ تھی کہ انہیں نظر آتا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انہیں خدا کے احکام کے مطابق چلائیں گے جس سے ان کی پیشوائیت ختم ہو جائے گی اور ان کی اولاد کو خود کما کر روٹی کھانی پڑے گی۔ یعنی مسئلہ سارا اپنے اقتدار اور معاش کا تھا جسے تحفظ ناموسِ شریعت کے نقاب میں چھپایا جا رہا تھا۔ میرا خیال ہے، برادران اس تاریخی شہادت کے بعد اس ضمن میں اس کے سوا اور کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ ؎

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے وہی فطرتِ اسد اللہی ، وہی مرحبی، وہی عنتری

.....☆☆☆☆☆☆.....

مشکلات کا حل:

اب میں عزیزانِ من! آپ کی توجہ ایک اور گوشے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ تحریکِ پاکستان کے دوران ہم سمجھے بیٹھے تھے کہ جونہی پاکستان بن گیا ہماری تمام مشکلات حل ہو جائیں گی۔ پاکستان بن گیا لیکن مشکلات ویسی کی ویسی ہی رہیں۔ پھر ہم سے یہ کہا گیا کہ جب ہمارا دستور بن جائے گا تو ہمارا پاپ کٹ جائے گا۔ چنانچہ وہ دستور بھی بن گیا جس کے بننے پر یہ فتویٰ دے دیا گیا کہ للہ الحمد! اب ہماری مملکت مسلمان ہو گئی ہے۔ لیکن ہمارے حالات کا سدھرنا تو ایک طرف، وہ پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گئے۔ اب ہم یہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ جب اسلامی قوانین مرتب ہو جائیں گے تو پھر حالات سنور جائیں گے۔ یاد رکھیئے! جس طرح محض پاکستان بن جانے اور موجودہ آئین مرتب ہو جانے سے ہمارے حالات نہیں سدھر گئے اسی طرح مروجہ قوانین کے ''کتاب وسنت'' کے مطابق مدون ہو جانے سے بھی ہماری عقدہ کشائی ازخود نہیں ہو جائے گی۔ اس کے لئے دو شرطیں ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ ہمارے دستور کو فی الواقعہ اسلامی ہونا چاہئے۔ اسلامی دستور کی رو سے

مملکت کی غرض وغایت بلکہ وجہء جواز (JUSTIFICATION FOR EXISTENCE) یہ ہوتی ہے کہ

اسلامی مملکت کے بنیادی خطوط:

(1) وہ تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کی پوری پوری ذمہ دار ہو اور

(2) وہ تمام ایسے اسباب وذرائع فراہم کرے جن سے افراد معاشرہ کی مضمر انسانی صلاحیتیں پورے طور پر نشوونما پاتی رہیں اور اس میں چھوٹے اور بڑے کی کوئی تمیز نہ ہو۔

(3) اس میں انصاف بلا قیمت اور بلا رعایت ملے اور کوئی فیصلہ حدود اللہ سے نہ ٹکرائے۔ اگر کسی مملکت میں ایک متنفس بھی رات کو بھوکا سو جائے (حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر گیا تو عمرؓ سے اس بابت قیامت میں باز پرس ہوگی) اگر اس میں یک فرد بھی بغیر کپڑے کے رہ جائے، اگر کوئی ایک خاندان بھی چھت سے محروم ہو، اگر کوئی ایک بچہ بھی صحیح تعلیم کے بغیر رہ جائے، اگر کوئی ایک مریض بھی بلا علاج کے مر جائے، اگر کسی غریب سے غریب انسان کی جان، مال، عزت، آبرو، محفوظ نہ رہے (یاد رہے کہ میں غریب سے غریب کا لفظ موجودہ معاشرتی حالات کے مطابق استعمال کر رہا ہوں ورنہ اسلامی مملکت میں کوئی غریب ہو نہیں سکتا) اگر لوگوں کو انصاف حدود اللہ کے مطابق بلا قیمت نہ ملے۔ غرضیکہ جس مملکت میں کوئی فرزند آدم اپنے آپ کو کسی ضمن میں بھی کسی دوسرے کا محتاج پائے یا اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے تو اس مملک کو قطعاً حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے آپ کو اسلامی مملکت اور اپنے آئین و قوانین کو قرآنی قرار دے سکے۔

کس نبا شد در جہاں محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبین این است وبس ❶

دوسری شرط یہ ہے کہ اس مملکت کے سربراہ اِن بنیادی تصورات پر دل سے یقین رکھیں، انہیں بروئے کار لانے کا عہد کریں اور خود اپنی زندگی حدود اللہ کی چار دیواری کے اندر بسر کریں۔

ہماری مملکت کے تصور میں یہ تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک افرادِ معاشرہ میں یہ احساس بیدار نہ ہو جائے کہ جو حکومت ان اسلامی تقاضوں کو پورا نہ کرے وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہہ سکیں کہ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ خَیْرًا مِّنْھُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ ﴿۴۱﴾ (70:40-41) ہم قانونِ خداوندی کی رُو سے اس پر قادر ہیں کہ تمہاری جگہ ایک بہتر حکومت کو لے آئیں اور تمہاری کوئی قوت ہمیں ایسا کرنے سے روک نہیں سکتی۔ یہی ہے برادران وہ صحیح جمہوریت جسے قرآن سکھانے کے لئے آیا تھا۔

ہماری ذمہ داری:

لیکن عوام میں یہ احساس بیدار نہیں ہو سکتا جب تک اس قرآنی فکر کو اس طرح عام نہ کیا جائے کہ ساری فضا اس سے متاثر

---

❶ دین کی واضح شرع کا نکتہ یہی ہے کہ دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔

ہو جائے۔ اور یہ ہے وہ فریضہ جسے، برادرانِ من! آپ نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ اس سے آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ یہ فریضہ کس قدر اہم، اور یہ کام کسقدر مشکل اور وسیع ہے۔ اگر آپ واضح تر الفاظ میں سننا چاہتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پاکستان کا مستقبل اور اس میں قرآنی نظام کا قیام صرف آپ احباب کی سعی و عمل کے ساتھ وابستہ ہے۔ میں نے صرف کا لفظ یونہی زور دینے کے لئے استعمال نہیں کیا، ایک امرِ واقعہ بیان کرنے کے لئے کیا ہے۔ اور وہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت قرآنی فکر کی یہ آواز آپ کے اس مختصر سے حلقہ کے سوا اور کہیں سے نہیں اُٹھ رہی۔ اس حلقہ کو چھوڑ دیجئے تو فضا میں چاروں طرف سے آپ کو یہ آواز سنائی دے گی کہ ؎

عرب کہ باز دہد محفلِ شبانہ کجا است؟ عجم کہ زندہ کند رودِ عاشقانہ کجا است؟
بزیرِ خرقہ ء پیراں سبوچہ ہا خالی است؟ فغاں کہ کس نہ شناسد مئے جوانہ کجا اسب؟ ❶

اس کے بعد آپ خود سوچ لیجئے، برادرانِ عزیز! کہ اگر ہماری کسی کوتاہی یا کم ہمتی، سہو یا لغزش سے یہ آواز دب کر رہ گئی تو فطرت کی عدالت میں ہمارا یہ جُرم کس قدر سنگین اور اس کی تعزیر کس قدر سخت ہوگی۔ وہ ستم رسیدہ اور محروم تمنا انسانیت، جسے ہم اس وقت پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ تمہاری مصیبتوں کا علاج اگر کہیں ہے تو، اسی (قرآنی) مینائے فکر و تصور میں ہے، جب ہماری کوتاہی ء عمل سے اس کا رشتہ ء امید منقطع ہو جائے گا تو وہ شاہراہِ زندگی پر ہمارا راستہ روک کر کھڑی ہو جائے گی، اور ہمارا گریبان پکڑ کر پوچھے گی کہ ؎

تھی اگر مَے سے صراحی تیری خالی ساقی تو چراغِ در میخانہ جلایا کیوں تھا؟
یوں اگر شورشِ ایام سے دب جانا تھا کوچہء عشق میں کیا کام تھا آیا کیوں تھا؟

سوچئے برادران! کہ اس وقت ہمارے پاس اپنی مدافعت کے لئے کیا جواب ہوگا؟ لہٰذا جسے اس پیغام رسانی کے فریضہ میں شریک ہونا ہے اسے سمجھ سوچ کر قدم اٹھانا چاہئے کہ اس کی ناکامی کی زد بہت دور تک پہنچے گی۔ نیز اسے یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ (جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے) قرآنی نظام کی طرف دعوت دینے والوں کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ اس دعوت کو دوسروں تک پہنچانے سے پہلے، اپنے اندر تطہیر فکر اور تعمیر سیرت پیدا کریں۔ جب تک خود ہماری فکر میں یہ تبدیلی پیدا نہیں ہو جاتی اور اس کی شہادت ہمارا کردار بہم نہیں پہنچا دیتا، ہم اس کے اہل ہی نہیں بن سکتے کہ دوسروں کو اس انقلاب کی طرف دعوت دیں۔ میں نے سال گزشتہ بھی کہا تھا اور اسے پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ انقلاب قرآنی کا مرحلہ بڑا صبر آزما اور ہمت طلب ہوتا ہے۔ یہ سفر صرف فکر و نظر کی پاکیزگی اور سیرت و کردار کی پختگی کے سہارے کٹتا ہے۔ اس میں نہ نمائش کے مواقع ہوتے ہیں، نہ نمود کی گنجائش۔ نہ ذاتی صلہ کی امید ہوتی ہے نہ ستائش کی توقع۔ اس میں عام پارٹیوں کی طرح عہدوں کی مسندیں ہوتی ہیں نہ مناصب کی لذتیں۔ بزم طلوع اسلام کسی پارٹی کا نام ہی نہیں۔ یہ بزم قرآنی فکر کی

---

❶ وہ عرب کہاں ہے جو پھر وہی محفلِ شبانہ سجائے۔ کہاں ہے وہ عجم جو دریائے عشق (وحی) کو از سرِ نو زندہ کرے۔ صوفیاء کے پاس خرقہ تو ہے لیکن ان کے سبو (معرفت قرآن) سے خالی ہیں۔ فریاد! کہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ تر و تازہ جوش دکھاتی (وحیٔ قرآنی کی) مَے کہاں ہے۔

نشر واشاعت کا منظم ذریعہ ہیں اور بس۔ اسی قرآنی فکر کی محسوس ومشہود شکل کا نام قرآنی ربوبیت ہے۔ آپ جتنی جلدی اس فکر کو عام کر دیں گیا اتنی ہی جلدی یہ نظام متشکل ہو جائے گا۔ یوں تو عام حالات میں بھی کون نہیں چاہتا کہ یہ نظام جتنی جلدی ہو سکے، وجہء شادابی ء کائنات بن جائے۔ ہم میں سے کون ہے جو راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر با چشم نم یہ دعائیں نہیں مانگتا کہ۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا اے فروغِ دیدہ امکاں بیا ❶

کمیونزم کا سیلاب:

لیکن ملک کے حالات جس تیزی سے بگڑ رہے ہیں، اس کے پیشِ نظر اس نظام کے قیام کے لئے ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ ملک، بھوک اور افلاس کے عذاب میں ایک مدت سے مبتلا چلا آ رہا ہے۔ لیکن اب گرانی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ جنہیں پہلے روٹی مل جاتی تھی وہ بھی پریشان ہیں کہ اس نہج سے گزارہ کیسے چلے گا۔ یہی ہیں وہ حالات جو کمیونزم کو بڑھ بڑھ کر آوازیں دیا کرتے ہیں۔ اس سیلابِ بلا کو صرف نظامِ ربوبیت روک سکتا ہے۔ اس وقت تک پاکستان کے مسلمان صرف اتنا سننے کے لئے تیار ہیں کہ اگر کوئی نظام ان کی روٹی کے مسئلہ کو حل کر دے اور اس کے ساتھ ہی ان کا دین بھی محفوظ رہے تو وہ نظام کمیونزم کے مقابلہ میں بہتر ہے۔ لیکن اگر ایک دفعہ کمیونزم کا نظام چھا گیا تو مجھے خطرہ ہے کہ پھر مسلمان اس قسم کی کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ پھر وہ (سنٹرل ایشیا کی مسلمان ریاستوں کی طرح) زیادہ سے زیادہ یہ مطالبہ کرے گا کہ اسے نماز پڑھنے کی اجازت دے دی جائے اور قرآن کی تلاوت سے روکا نہ جائے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس وقت ہم تاریخ کے کس نازک دوراہے پر کھڑے ہیں اور زمانے کے تقاضے ہم سے پکار پکار کر کس چیز کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ الحاد اور بے دینی کا جو آتشیں طوفان ہماری طرف امنڈے چلا آ رہا ہے، افسوس ہے کہ ہمارے اربابِ شریعت کو اس کا قطعاً احساس نہیں۔ وہ خود بھی شیعہ، سنّی، مقلد، غیر مقلد، دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، اہل قرآن کے جھگڑوں میں الجھے ہوئے ہیں اور اُمت کو بھی اسی میں الجھائے رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ انہیں مسائل کے حل کو جہادِ عظیم سمجھتے ہیں کہ

ابنِ مریم مرگیا یا زندۂ جاوید ہے ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جُدا یا عین ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات

وہ الٰہیات ومعتقدات کے ان ترشے ہوئے لات ومنات کے طواف میں مصروف ہیں اور خدا فراموشی کی ابلیسی قوتیں اپنے کارندوں کو تاکید پر تاکید کئے جا رہی ہیں کہ ؎

مست رکھو ذکر وفکرِ صبحگاہی میں انہیں پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں انہیں

تاکہ..... ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں۔ دوسری طرف اہل سیاست ہیں ان کے متعلق اس سے زیادہ (اور بہتر)

---

❶ اے زمانے کے شاہ سوار اور اے امکانات کی دنیا کو روشن کرنے والے! اب آ بھی جایئے

کیا کہا جا سکتا ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾ جَهَنَّمَ ۚ (14:28) کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جنہوں نے خدا کی نعمت کی ناسپاس گزاری کی اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں جا اتارا، یعنی جہنم میں۔ یہ ہیں ہمارے میر کارواں، قوم کو جہنم کے عمیق گڑھے میں دھکیل کر، خود آتشیں رقص میں مصروف ہیں۔ انہیں اس سے کیا غرض کہ یہاں کفر کا غلبہ ہوتا ہے یا اسلام کا۔ ان کی حالت تو یہ ہے کہ ؎

بآدمے نرسیدی خدا چہ می جوئی! ❶

ان حالات میں، برادران! سوچئے کہ آپ کی ذمہ داریاں کس قدر شدید اور عظیم ہو جاتی ہیں۔

.....☆☆☆☆☆.....

اس مقام پر مجھے ایک الجھن کا ذکر کرنا ہے جو اکثر احباب کے دل کو طلسم پیچ و تاب بنائے رکھتی ہے اور جس کے متعلق وہ اکثر و بیشتر مجھ سے دریافت کرتے رہتے ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ملک کی دوسری تحریکیں بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں اور ہماری تحریک کی رفتار بڑی سُست ہے۔ یہ درست ہے لیکن اس ضمن میں یہ حضرات اُس بنیادی فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو عام تحریکوں میں اور دعوتِ انقلاب میں ہوتا ہے۔

ایک بنیادی فرق:

دنیا میں جو شخص ان عقاید و نظریات کی تائید کے لئے اٹھتا ہے جو لوگوں میں رائج ہوتے ہیں (بغیر تحقیق کئے کہ وہ صحیح ہیں یا غلط) اس کے لئے زندگی کی راہیں بڑی آسانیوں اور خوش خرامیوں کی راہیں ہوتی ہیں۔ ہر وادی کہکشاں بار اور ہر گوشہ زعفران زار۔ وہ جب پہلے دن اپنی آواز بلند کرتا ہے تو لاکھوں کروڑوں انسانوں کو اپنا ہم نوا پاتا ہے۔ وہ، جب اور جہاں، اپنے سامعین سے خطاب کرتا ہے تو ان میں سے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

وہ جب ان متوارث رسوم و مسالک کی تائید میں (بزعمِ خویش) دلائل پیش کرتا ہے اور دنیا میں کون سا عقیدہ اور تصور ایسا ہے جس کے حق میں عقلِ حیلہ جو، دلائل نہیں تراش سکتی۔ تو عوام کا گروہِ عظیم اُسے اپنے عہد کا سب سے بڑا مفکر قرار دیتا ہے۔ وہ جس طرف سے گزرے، ہزاروں انسان اس کے پیچھے چلتے ہیں۔ اس طرح وہ ان کا مسلمہ لیڈر بن جاتا ہے۔ عقیدت منداس کے لئے دیدہ و دل فرشِ راہ کرتے اور اس کے حضور سر نیاز خم کرتے ہیں۔ ہر طرف سے اُس پر پھولوں کی بارشیں ہوتی ہیں۔ ہر سمت سے ''زندہ باد'' کے فلک بوس نعروں سے استقبال کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے دنیا بھر کے سامانِ راحت و آسائش مہیا کئے جاتے ہیں۔ متبعین اس کے جلو میں اور خدام اس کی بارگاہ میں دست بستہ ایستادہ رہتے ہیں۔ اس کے سب کام بلا مزد و معاوضہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہر معتقد اس کی خدمت کو موجب ہزار ثواب و سعادت سمجھتا ہے۔ وہ جس شخص یا گروہ کو اپنا حریف خیال کرتا ہے، اسے کچلنے کے لئے اسے اس سے زیادہ کچھ نہیں کرنا پڑتا کہ وہ عوام کو یہ کہہ کر مشتعل کر دے کہ یہ فتنہ پرداز تمہیں، تمہارے اسلاف کے راستے

❶ تو آدمی تک تو پہنچا نہیں، خدا کو کیا ڈھونڈتا ہے۔

سے برگشتہ کرنا اور اس طرح ایک نئے دین کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا، اس کی مخالفت ''جہاد فی سبیل اللہ'' کا درجہ رکھتی ہے۔ اس مہم کو سر کرنے کے لئے دولت کے ڈھیر اس کے قدموں میں لگ جاتے ہیں اور رضا کاروں کی جماعتیں اس کے اشارہ پر جان تک دینے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ جو شخص عوام کے معتقدات اور نظریات کی تائید کے لئے اٹھتا ہے، عزت، آسائش، دولت، قوت، امارت کی فتوحات اس کے حصے میں آتی ہیں اور اس کی تحریک جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی چلی جاتی ہے۔

اس کے برعکس اس تحریک پر غور کیجئے جو عوام کی رو میں بہنے کی بجائے زمانے کے دھارے کا رُخ صحیح سمت کی طرف موڑنے کے لئے اٹھتی ہے۔ وہ مروجہ عقاید اور موروثی نظریات میں سے ایک ایک کو لیتی ہے اور انہیں ایک غیر متبدل معیار پر پرکھ کر حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دیتی ہے۔ اس تحریک کا داعی جب عوام کے کسی غلط عقیدہ یا مسلک کے خلاف لب کشائی کرتا ہے تو بھری محفل میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ اس کا کوئی محرم اور ہم نوا نہیں ہوتا۔ اسے کوئی ایک ساتھی بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اس کی تائید کے لئے اس کے ساتھ کھڑا ہو جائے۔ وہ اپنے پیغام کو لے کر کو بہ کو، دہ بدہ، قریہ بہ قریہ پھرتا اور ہر ایک سے کہتا ہے کہ

بیاورید گر ایں جا بود سخندانے غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد ❶

لیکن کوئی اس کی آواز پر کان نہیں دھرتا۔ وہ تھک کر بیٹھ جاتا ہے اور ایک گہری سوچ میں ڈوب کر اپنے آپ سے کہتا ہے

کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر ❷

لیکن اس کے پیغام کی صداقت اور اس صداقت پر اُس کا یقین اُسے آرام سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ وہ پھر اُٹھتا ہے اور باندازِ دگر اپنا پیغام لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ کچھ لوگ اس کے قریب آتے ہیں اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ لیکن وہ یہ جانتے ہوئے کہ یونہی سطحی طور پر کسی انقلابی دعوت کی تائید کرنے والے اپنے آپ کو اور خود اس دعوت کو کس قدر نقصان پہنچاتے ہیں، ان سے کُھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ

زمرغانِ چمن نا آشنایم بشاخ آشیاں تنہا سرایم
اگر نازک دلی از من کراں گیر کہ خونم می تراود از ندایم

وہ اپنے پیغام کو اسی طرح دُہرائے چلا جاتا ہے تا آنکہ وہ (پیغام) فضا میں اپنے نقوش مرتب کرنے شروع کر دیتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کو خطرہ محسوس ہوتا ہے جو اس کی اس انقلابی دعوت میں اپنی مفاد پرستیوں کی ہلاکت دیکھتے ہیں، وہ اس کی مخالفت میں اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ مخالفتوں کے اس ہجوم کے مقابلے میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے اور اپنے اللہ سے دعا کرتا ہے کہ

با پرستارانِ شب دارم ستیز باز روغن در چراغِ من بریز ❸

---

❶ اگر اس جگہ کوئی (میرا) ہم زباں، کوئی ہم نفس کوئی ترجمان ہے تو اے لوگو! اُسے میرے سامنے لاؤ، کہ اِس غریب شہر اور اس اجنبی کے پاس کہنے سننے کی بہت سی باتیں ہیں۔ ❷ میں اس زمین پر شاید کسی اور ہی جہان سے آنے والا پہلا آدمی ہوں مطلب یہ کہ اس دنیا میں میرے افکار کو پہچاننے والا کوئی نہیں۔
❸ میں تاریکی کے پرستاروں (یعنی باطل قوتوں کے پجاریوں) سے الجھتا ہوں حضور ﷺ میرے چراغ میں پھر سے تیل ڈال دیجئے۔

یہ ہے وہ تحریک جسے لے کر آپ اُٹھے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ اس قدر سُست گام کیوں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کو تو اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھنا چاہئے کہ اس بے سروسامانی کے عالم میں اور اس تھوڑے سے وقت میں یہ تحریک ایسے خوشگوار نتائج کی حامل ہوگئی ہے، ورنہ ایسی تحریکوں میں تو اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے کہ اس کا داعی تنہا رہتا ہے اور یہ کہہ کر تنہا یہاں سے چلا جاتا ہے کہ

چوں رختِ خویش بربستم ازیں خاک ہمہ گویند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود ❶

یعنی یوں تو اس کے گرد جاننے پہچاننے والوں کا ایک جمگھٹا رہتا ہے لیکن ان میں سے کوئی نہیں جانتا کہ اس کا پیغام کیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق جرمن شاعر (RILKE) نے کہا ہے کہ:

E a c h torpid turn of this world bears such disinherited children to whom neither what's been, nor what is coming, belongs.

یعنی جب دنیا جمود و تعطل کے بعد ایک نیا موڑ مڑنے لگتی ہے تو وہاں کچھ ایسے ''محروم لاوارث یتیم'' نظر آتے ہیں جو حاضر و موجود کو از خود تیاگ دیتے ہیں اور جو کچھ اس کی جگہ متشکل ہونے والا ہوتا ہے وہ ہنوز ضمیر کائنات میں پہلو بدل رہا ہوتا ہے اور اس کے آب و تاب سے موزوں ہونے میں ابھی وقت ہوتا ہے اس لئے وہ اس سے بھی بہرہ یاب نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا وہ ماضی اور مستقبل دونوں سے محروم رہتے ہیں۔ یہ حالت ہوتی ہے اس داعیء انقلاب کی جس کے نزدیک مروج و موجود غلط قرار پائے اور اس کی جگہ جن اقدار کے متمکن ہونے کے لئے وہ مصروفِ جدوجہد رہے وہ اس کی زندگی میں وجود پذیر نہ ہوں۔ وہ دنیا میں تنہا آتا ہے اور تخمِ انقلاب کی آبیاری کر کے تنہا دنیا سے چلا جاتا ہے کہ بعد میں آنے والے اس کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہوں۔ اسے اس کا افسوس نہیں ہوتا کہ اس نے اپنی جانفشانیوں کے نتائج اپنی آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھے۔ اب آپ نے سمجھ لیا برادران! کہ آپ کی تحریک سُست گام کیوں ہے؟

.....☆☆☆☆☆.....

اب میں برادران! چند الفاظ آپ کی اس تنظیمی کوشش یا تحریک کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں جسے بزم طلوع اسلام کہتے ہیں اور جس کا دوسرا سالانہ اجتماع اس وقت منعقد ہو رہا ہے۔ میں اس قرآنی فکر کو جو مجلہ طلوع اسلام اور اس کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کے ذریعے آپ تک پہنچ رہی ہے، ایک عرصہء دراز تک انفرادی طور پر پھیلائے چلا جا رہا تھا۔ جو احباب اس فکر سے متفق تھے وہ بھی اپنی اپنی جگہ انفرادی طور پر اس کی مزید نشر و اشاعت کی کوشش کرتے تھے۔ چند سال اُدھر کا ذکر ہے کہ

بزم طلوع اسلام:

مردان کے احباب نے لکھا کہ ہم نے اپنے ہاں طلوع اسلام کی ایک بزم بنانی ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ اس قرآنی

---

❶ جب مَیں نے اس دنیا سے رختِ سفر باندھا، تو سب نے کہا یہ ہمارا جاننے والا تھا۔ مگر کوئی نہیں سمجھا کہ اس مسافر (اقبال) نے کیا کہا، کس سے کہا اور یہ کہاں سے تھا۔

فکر کو باہمی افہام وتفہیم سے اچھی طرح سمجھا جائے اور پھر اس کی نشر واشاعت کی اجتماعی کوشش کی جائے۔ میں نے اُنسے کہا کہ یہ خیال نیک ہے اور یہ ارادہ مبارک، لیکن اس کی سخت احتیاط برتئے کہ آپ کی یہ اجتماعی کوشش کہیں پارٹی کا رنگ نہ اختیار کر جائے۔ اس لئے کہ اگر ایسا ہو گیا تو ہم اس اصل بنیاد ہی کے خلاف چلے جائیں گے جس پر قرآنی فکر کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس طرح برادران! پہلی بزم طلوع اسلام وجود میں آئی۔ اس کے بعد بعض دیگر مقامات کے احباب نے بھی (ازخود) اسی قسم کی بزمیں قائم کرلیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، یہ بزمیں اس سے زیادہ کچھ نہیں تھیں کہ جو مقامی احباب اس فکر سے متفق تھے وہ مل بیٹھ کر تبادلہء خیالات کرتے اور اس پیغام کو دوسروں تک پہچانے کی تجاویز سوچتے۔ ان بزموں کے نہ کوئی قواعد وضوابط تھے نہ دساتیر ومنشور۔ نہ رسمی کاروائیاں تھیں نہ آئینی حدود بندیاں۔ چند دوستوں کی نجی نشستیں تھیں جن میں قرآنی نظام کی حقیقتِ منتظر کو لباسِ مجاز میں دیکھنے کی تڑپ اور خلش کے پُرخلوص مظاہرے ہوتے تھے۔ جب بزموں کا یہ سلسلہ زیادہ پھیل گیا تو (سالِ گزشتہ) لاہور کے احباب نے یہ تجویز کیا کہ بزموں کے احباب کا باہمی تعارف ہونا چاہئے تاکہ اس ربط وضبط سے کام آگے بڑھایا جاسکے۔ اس طرح طلوع اسلام کی پہلی کنونشن کا انعقا ہوا۔ جو احباب اس میں شریک ہوئے تھے وہ اس کے شاہد ہیں کہ یہ اجتماع اپنے انداز کا بالکل نرالا اور اپنے رنگ کا یکسر انوکھا اجتماع تھا۔ یوں نظر آتا تھا جیسے ایک خاندان کے افراد اپنے گھر میں بیٹھے محبت اور پیار کی باتیں کررہے اور گھر کی بہبود اور خوشحالی کی تجاویز سوچ رہے ہوں۔ اس اجتماع کی سادگی میں ایک عجیب انداز کا حُسن اور اس کے حُسن میں ایک خاص وضع کی پاکیزگی تھی۔ یہ سب کچھ تھا لیکن مجھے رہ رہ کر یہ خدشہ (یا اس خدشہ کا وہم) ستا رہا تھا کہ خدانہ کرے اس میں پارٹی بازی کا کوئی شائبہ آجائے۔ میرے بعض دوست مجھ سے کہا کرتے ہیں کہ تم اس باب میں بہت زیادہ وہمی واقع ہوئے ہو۔ میں اس کے جواب میں اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ

کے توانم دید زاہد جامِ صہبا بشکند می پرد رنگم حبابے گر بدریا بشکند ❶

یہی وہ (حقیقی یا وہمی) خدشہ تھا جس کے پیشِ نظر آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے سال گزشتہ کے خطاب میں اس بات پر کس قدر زور دیا تھا کہ اس تنظیمی کوشش میں پارٹی بازی کا رنگ نہ آنے پائے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس کنونشن کی کامیابی نے اس فکر ونظام کے مخالفین کو بہت زیادہ متردد وبے چین کردیا اور انہوں نے اس کی تخریب کے لئے ایک نیا پروگرام تجویز کیا۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جب اہل کتاب کی تمام کوششیں، اسلام کی انقلابی تحریک کو نقصان پہنچانے میں ناکام رہ گئیں تو انہوں نے اپنا پینترا بدلا اور اس کی زیرنقاب مخالفت کے لئے ایک نیا حربہ اختیار کیا۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ: اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (3:72) تم یوں کرو کہ صبح کے وقت ان مسلمانوں سے کہو کہ ہم بھی ایمان لائے ہیں۔ دن بھر ان میں مسلمان بن کر رہو۔ اس طرح ان کے اندر داخل ہوکر، ناصحِ مشفق کے لباس میں، ان سے ایسی باتیں کرو جن سے ان کے دلوں میں شکوک وشبہات اور ان کی تنظیم میں تشتت وانتشار پیدا ہوجائے۔ اس طرح ہوسکتا ہے کہ جب تم شام کو کفر کی طرف لوٹو تو تمہارے ساتھ ان میں سے دس بیس ادھر آجائیں۔

❶ جس کا یہ حال ہو کہ وہ دریا میں حباب کو ٹوٹتے ہوئے دیکھے تو افسوس سے اس کا رنگ اُڑ جائے وہ یہ کیسے سہہ سکتا ہے کہ اُس کے سامنے زاہد شراب سے بھرے گلاس کو توڑ رہا ہو۔

وسوسہ انگیزی:

یہ تھے وہ لوگ جن کی اس سازش سے بچنے کے لئے قرآن کریم کی آخری دوسورتوں میں اس قدتاکید آئی ہے۔ مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ ۙ الۡخَنَّاسِ ۪ۙ الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ۙ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ ﴿۶﴾ (114:4-6) ان میں تمہارے جانے پہچانے لوگ بھی ہوتے ہیں اور اجنبی بھی۔ وہ تمہاری جماعت میں داخل ہوجاتے ہیں شکاریوں کی طرح دبے پاؤں آ کر چپکے چپکے کانوں میں کچھ پھونک دیتے، اور چوروں کی طرح پچھلے پاؤں لوٹ جاتے ہیں۔ وہ ان وسوسہ انگیزیوں سے تمہارے عزائم کو کمزور کر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وَ مِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِ ۙ (113:4) اور ان کی تخریبی سازشوں کا جذبہء محرکہ حسد ہوتا ہے۔ وَ مِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾ (113:5)

سالِ گزشتہ میں مخالفت:

یہی تھا وہ فیصلہ جو قرآنی فکر کے مخالفین نے سال گزشتہ کیا۔ چنانچہ سال کے دوران مختلف مقامات سے جو اطلاعات بہم پہنچتی رہیں وہ اس حقیقت کی صاف صاف غمازی کر رہی تھیں کہ یہ مخالفین ناصحینِ مشفق اور ہمدردانِ غمخوار کے نقاب میں طلوع اسلام کی بزموں میں آ گئے ہیں اور اپنی تخریبی کاروائیوں میں مصروف ہیں۔ جیسا کہ آپ احباب کو معلوم ہے، ہمارے ہاں کوئی راز نہیں، کوئی پس پردہ اسکیم نہیں۔ ہم کمروں کے اندر اپنی نجی محفلوں میں بھی وہی کچھ کرتے ہیں جو عام پبلک میں پیش کرتے ہیں۔ یہ کچھ ہم زبانی نہیں کہتے بلکہ لکھ کر شائع کر دیتے ہیں۔ ہمارا ایک ایک لفظ دوسروں کے پاس موجود ہے۔ اس لئے ہمیں اس سے قطعاً خطرہ نہیں کہ یہ لوگ ہماری محفلوں میں زیرِ نقاب آ جاتے ہیں۔ یہ اس طرح آ کر لیں گے کیا؟ آپ کو اُس شخص کی کہانی تو یاد ہوگی جس کے ہاں رات کو چور گھُس آیا۔ اس کی آنکھ کھل گئی تو اس نے لیٹے ہی لیٹے چور سے کہا کہ بھائی! مجھے اس گھر میں دن کے وقت کچھ نہیں ملتا، تمہیں رات کے وقت کیا ملے گا؟ اس لئے ہمیں اُن کی یہ دُزدانہ کاوشیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ جو چیز ہمیں نقصان پہنچاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ طرح طرح کی وسوسہ انگیزیوں سے آپ کی جماعتی زندگی میں انتشار پیدا کرتے ہیں۔ آپ کو نظری مباحث کی موشگافیوں اور تجریدی مسائل کی نکتہ آفرینیوں میں الجھائے رکھتے ہیں تاکہ آپ کسی عملی پروگرام کی طرف توجہ ہی نہ دے سکیں۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ آپ کی یہ تنظیمی کوشش کسی نہ کسی طرح پارٹی کی شکل اختیار کر جائے۔ وہ بزموں کے اندر تو یہ کچھ کرتے ہیں اور باہر جا کر طلوع اسلام کے مسلک و مقصد اور فکر و تعلیم کے متعلق لوگوں سے اس قسم کی باتیں کہتے ہیں جو طلوع اسلام کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتیں۔ لوگ یہ سمجھ کر کہ یہ بزم طلوع اسلام کے ممبر ہیں، اس لئے ''رازِ درونِ خانہ'' سے واقف ہیں، ان خرافات کو سچا سمجھ لیتے ہیں۔ یہ ہے وہ سب سے بڑا نقصان جو قرآنی فکر کو ان لوگوں کی طرف سے پہنچایا جا رہا ہے۔

نادان دوست:

یہاں تک تو اُن مخالفین کا ذکر تھا جو بغرض تخریب طلوع اسلام کی بزموں میں شامل ہوتے ہیں لیکن اُن سے کہیں زیادہ نقصان کا باعث وہ نیک نیت لیکن سادہ لوح حضرات ثابت ہوتے ہیں جو اِن زیرِ نقاب ناصحین کے دامِ تزویر کا شکار ہو کر نا دانستہ اُن کا آلہء کار بن جاتے ہیں۔ اُن ''دانا دشمنوں'' کے متعلق تو آپ تحقیقات کے بعد، یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس تنظیم میں

شامل ہی تخریب کی غرض سے ہوئے تھے، لیکن ان ''نادان دوستوں'' کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟

ایک انقلابی دعوت کو (یعنی اس تحریک کو جس کا مقصد فکر و نظر میں انقلاب پیدا کرنا ہو) اپنے ابتدائی مراحل میں، اس قسم کے خطرات کی طرف سے بڑا محتاط رہنا پڑتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کا علاج تعوذ بتایا ہے۔ (قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ﴿۱﴾ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾) العوذ اُونٹنیوں اور گھوڑیوں کے اُن نوزائیدہ بچوں کو کہتے ہیں جنہیں اپنی حفاظت کے لئے ہر وقت ماں کے قریب رہنا ہوتا ہے۔ عاذت بولدھا کے معنی ہیں نوزائید بچے کے پاس کھڑے رہنا اور اس کی حفاظت کرنا۔ المعوذ اس چراگاہ کو کہتے ہیں جو گھر کے آس پاس ہوتا کہ اس میں جانور اور اس کے بچے ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہیں۔ تعوذ کے معنی ہیں اپنے چشمہء فکر اور مرکزِ نظام (قرآن) کے ساتھ اس طرح متمسک رہنا جس طرح نوزائیدہ بچے ماں کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ ایک نوزائیدہ تحریک کو خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے قرآن نے کیا طریق بتایا؟ یہ کہ اُس تحریک کے مُخلص افراد کو اپنے مرکز فکر و نظام سے زیادہ سے زیادہ قریب رہنا چاہئے۔ ہر خطرہ کے وقت بھاگ کر اس کی پناہ میں آ جانا چاہئے۔ اور ہر پیش نظر معاملہ کو اُس کی طرف (REFER) کر دینا چاہئے۔

علاج:

یہی وہ طریقِ کار ہے جس کی طرف سورہء نساء میں ان الفاظ میں توجہ دلائی گئی ہے۔ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ (4:83) جب ان کے پاس، امن یا خوف کی کوئی بات پہنچتی ہے تو یہ اُسے یونہی لے اُڑتے ہیں۔ اگر یہ (اس کی بجائے) اُس بات کو رسول کی طرف یا صاحبانِ اختیار کی طرف لوٹا دیں، تو اُن میں سے جو اس کی تحقیق کریں وہ حقیقت تک پہنچ جائیں۔ یعنی پیشِ نظر معاملات میں از خود فیصلہ کر کے اُن پر عمل پیرا ہونے کی بجائے اُنہیں اپنے مرکز اور اربابِ اختیار کی طرف لوٹا دینا چاہئے۔ اس ضرورت اور احتیاط کی اہمیت کے پیشِ نظر، برادران! میں نے اب مناسب سمجھا ہے کہ بزموں کے نظم و نسق اور باہمی ربط و ضبط کے متعلق کچھ ہدایات منضبط کر دی جائیں تا کہ اُن سے مخلص رفقائے سفر کو راہ نمائی مِل سکے۔ یہی ہدایات سر دست آپ کے لئے دستور و آئین کا کام دینگی۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ ان ہدایات کو بغور دیکھ لیں۔ جو حضرات ان سے متفق ہوں وہ اپنے آپ کو بزمِ طلوع اسلام سے متمسک رکھیں۔ جو یہ سمجھیں کہ اس سے ان کا دائرہ فکر و عمل تنگ ہو جائے گا، وہ اپنی تگ و تاز کے لئے دوسرے میدان تجویز کر لیں۔ قرآنی فکر و عمل طلوع اسلام کی اجارہ داری نہیں۔ جن کے دل میں اس کی لگن ہو وہ جو لائحہ عمل اور طریقِ کار اپنے لئے مناسب سمجھیں، اختیار کر سکتے ہیں لیکن (آپ مجھ سے متفق ہوں گے) کہ یہ ضروری ہے کہ جب تک کوئی شخص بزمِ طلوع اسلام سے وابستہ رہے، اس کے لئے طلوع اسلام کی طرف سے نافذ کردہ ہدایات کی پابندی لازمی ہوگی۔ یہ صورت تو کسی کے نزدیک بھی قابلِ قبول قرار نہیں پا سکتی کہ آپ ممبر تو ہوں بزمِ طلوع اسلام کے اور اپنے فکر و عمل میں طلوع اسلام کے مسلک کے خلاف چلیں۔

.....☆☆☆☆☆.....

برادرانِ گرامی قدر! میں نے آپ سے جو کچھ عرض کرنا تھا کر چکا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری گزارشات کو پورے جذب وانہماک سے سُنا۔ آخر میں، میں اس حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ مبداءِ فیض کی انتہائی کرم گستری ہے کہ اس نے مجھے آپ جیسے مخلص احباب کی رفاقت سے نوازا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سفرِ حیات میں کسی رفیقِ غمخوار ودمساز کا مِل جانا، راستے کی مشکلات کو آسانیوں میں بدل کر منزل کو قریب سے قریب تر لے آتا ہے۔ آپ احباب کی رفاقت نے میری عمر رفتہ کو آواز دے کر، میری آرزوؤں کو جوان، میری ہمتوں کو بلند، میرے ارادوں کو مستحکم، میرے جینے کو پُر بہار اور میرے مرنے کو پُر کیف بنا دیا ہے۔ کرم کردی الٰہی بخش زندہ باشی! چہ عجب کہ اس سے میرے وہ تصورات جنہیں میں اس سے پہلے زندگی کے حسین خواب اور ''نور ونکہت کی داستانِ خموش'' سے زیادہ نہیں سمجھا کرتا تھا، ایک جیتے جاگتے جہانِ نو کے حسین پیکر میں وجہءِ شادابیءِ قلب ونظر بن جائیں۔ یہی وہ جہانِ نو ہے جس کی تلاش میں، جنت سے نکلا ہوا آدم، صدیوں سے مارا مارا پھر رہا ہے اور کہیں پناہ نہیں پاتا۔ یہی وہ فردوس گم گشتہ ہے جو اس کی آرزوؤں کا منتہیٰ، اس کی امیدوں کا ماویٰ وملجا اور اس کی زندگی کا آخری سہارا ہے۔ یہی وہ جنتِ ارضی ہے جس کے دروازے پر چاند کی نورانی کرنوں سے لکھا ہوا ملتا ہے کہ

وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ (3:96) جو اس میں داخل ہو گیا، دنیا کے ہر خطرے سے محفوظ ومصئون ہو گیا۔

سوچئے برادرانِ عزیز! کہ اگر آپ کے ذوق وشوق، آپ کے سوز وگداز، آپ کے نالہءِ نیم شبی، آپ کی آہِ سحر گاہی، آپ کی تگ وتاز، آپ کی سعی وعمل سے، انسان کے سامنے اس جنت کے دروازے کھل جائیں اور فضا اس زمزمہءِ تبریک وتہنیت سے گونج اٹھے کہ

بر خیز کہ آدم راھنگامِ نمود آمد ایں مشتِ غبارے را انجم بسجود آمد

تو اس سے بڑے طالع کی بیداری اور نصیبہ کی یاوری اور کیا ہوگی؟ اے کاروانِ جذب ومستی اور اے رہروانِ منزلِ شوق! آگے بڑھیئے کہ دنیا یہ کہتی ہوئی آپ کے انتظار میں کھڑی ہے کہ

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

خدا کی نُصرت اور اُس کی کائناتی قوتوں کی تائید آپ کے ساتھ ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝۳۰ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝۳۱ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۝۳۲ (41:30-32)

والسلام

پرویز

پرویز علیہ الرحمۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(سورۃ الفاتحہ آیت نمبر:4)

درسِ قرآن

عزیزانِ من! سابقہ درس سورۃ الفاتحہ کی چوتھی آیت کے پہلے ٹکڑے پر مشتمل تھا: اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) اور آج کا درس اس کے اگلے ٹکڑے پر مشتمل ہوگا: وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (1:4)۔ ان الفاظ کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے: ''ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں''۔ یعنی اس پوری چوتھی آیت کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ ''تیری ہی ہم پرستش کرتے ہیں اور تجھ ہی سے ہم مدد مانگتے ہیں''۔ پرستش والی بات کے متعلق تو میں سابقہ درس میں بتا چکا ہوں۔ اسی میں عبادت کے مفہوم سے اس آیت کے پہلے ٹکڑے کی وضاحت واضح ہوگئی تھی۔ اب یہ جو ''تجھ ہی سے ہم مدد مانگتے ہیں'' اس میں آپ دیکھیے کہ مدد کے لیے عربی زبان اور قرآنِ کریم میں بہت سے دوسرے الفاظ بھی آئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہاں اس لفظ کا انتخاب کیوں کیا گیا ہے۔

قرآنِ حکیم کے ایک ایک لفظ کا انتخاب بذاتِ خود ایک ایسا اعجاز ہے کہ جس کا ترجمہ ممکن ہی نہیں:

جیسا کہ میں بار بار بتاتا چلا آ رہا ہوں کہ عربی زبان بڑی وسیع المعانی ہے جس میں ایک ایک چیز کے لیے سینکڑوں الفاظ آتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اپنے مقاصد اور مطالب کے اظہار کے لیے ان متعدد الفاظ میں سے جن کا انتخاب کیا ہے، وہ بذاتِ خود قرآن کا اعجاز ہے۔ اس لیے قرآن نے جس مقام پر جس لفظ کو استعمال کیا ہے، دیکھنا یہ ہوگا کہ اس نے وہاں اسی لفظ کو کیوں منتخب کیا ہے۔ اگر یہ حقیقت سامنے آ جائے تو نہ صرف یہ کہ اس سے متعلقہ آیت کا مفہوم واضح ہو جائے گا بلکہ اکثر و بیشتر قرآنِ کریم کی پوری کی پوری تعلیم یا اس کی غرض و غایت، حکمت کی ایک جھلک بھی، سامنے آ جائے گی۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ کے صحیح مفہوم کا سمجھنا از بس ضروری ہے۔ ان الفاظ کے ترجمہ سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ پہلے بھی میں کہہ چکا ہوں ترجمہ تو ان الفاظ کا ہو ہی نہیں سکتا، دنیا کی کسی زبان میں بھی نہیں ہوسکتا۔

زیرِ نظر آیت کے پہلے حصے میں اِیَّاکَ نَعۡبُدُ (1:4) ہا گیا تھا۔ اس میں آپ نے دیکھ لیا تھا کہ عبدیت کے معنی ''اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو ضابطہ خداوندی کے مطابق صرف کرنا ہے'' اور تعبیر کا لفظ بھی آپ کے سامنے آ گیا تھا جس کے معنی تھے ''ان صلاحیتوں کو نشوونما دینے کے بعد انہیں متعینہ قوانین اور قواعد و ضوابط کے مطابق صرف کرنا، ان صلاحیتوں کی نشوونما

کرنا اور اس کے بعد انہیں ان ساحلوں کے اندر رکھتے ہوئے‘ صرف کرنے سے نتیجہ نکالنا۔‘‘ یہ ہم اس سے پہلے والے درس میں بتا چکے تھے۔ میں نے بتایا تھا کہ قرآن نے کہا ہے کہ یہ تمام چیزیں‘ تمہارے ایک مقصد کے بروئے کار لانے کے لیے ہیں‘ تمہارے فائدے کے لیے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس سے تمہاری منفعت کیا ہوگی؟ اس کے لیے کہا کہ اس سے تمہاری ذات کی نشوونما ہوگی اور اس میں اعتدال پیدا ہو جائے گا۔ میں نے کہا ہے کہ اس سے Developed and Balanced Personality (نشوونما یافتہ اور متوازن شخصیت) پیدا ہو جائے گی۔ ہر ایک فرد میں پیدا ہوگی اور ان افراد کے مجموعے سے جو نظام قائم ہوگا‘ وہ تمام عالمِ انسانیت کے لیے موجبِ فلاح و بہبود اور امن و سلامتی ہوگا۔ تو گویا اِیَّاکَ نَعْبُدُ (1:4) کے اندر یہ بات مضمر تھی کہ ہم اپنی صلاحیتوں کی نشوونما چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انہیں تیرے قوانین کے تابع صرف کریں گے۔ اس صرف کرنے سے جو چیز پیدا ہوگی وہ اس آیت کے اگلے دو الفاظ: وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) میں ہے۔ سورۃ فاتحہ کے لفظ ’’نَسْتَعِیْنُ‘‘ کی وضاحت وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) میں ’’نَسْتَعِیْنُ‘‘ کا مادہ ’’ع و ن‘‘ ہے۔ عربی زبان ’’عوان‘‘ اس جانور یا انسان کو کہتے ہیں جو بھرپور شباب کے عالم میں ہو‘ اس کی توانائیاں نشوونما پا چکی ہوں‘ اس شرط کے ساتھ کہ ان میں پورا پورا اعتدال بھی ہو۔ لہٰذا اس ’’استعان‘‘ کے معنی ہوں گے: ’’اپنی ذات کے لیے پوری پوری نشوونما اور اعتدال کی آرزو کرنا اور اس مقصد کے لیے کسی کی مدد طلب کرنا۔‘‘ اسی نہج سے اللہ تعالیٰ کو اَلْمُسْتَعَانُ (21:112) کہا گیا ہے۔ ’’استعان‘‘ کے اس مفہوم کے بعد جب ہم وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) کہتے ہیں‘ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ’’اے خدا! اے اللہ! ہم تجھ سے یہ چاہتے ہیں‘‘ تو اس میں خدا سے چاہنا‘ طلب کرنا‘ اپنی آرزو کے پورا کرنے کے لیے اس سے کہنا‘ یہ تمام چیزیں اس استعان کے اندر آ جائیں گی۔ اس سے آپ دیکھیے گا کہ فوراً آپ کے ذہن میں ’’دعا‘‘ کا لفظ آئے گا‘ دعا کا تصور آئے گا کہ ہم خدا سے ’’دعا‘‘ کرتے ہیں کہ ہم ایسے ہو جائیں۔

نستعین کے مفہوم سے پہلے لفظ دعا کی وضاحت کرنا ضروری ہے

جب تک دعا کا مفہوم سمجھ میں نہیں آئے گا اس وقت تک نہ صرف یہ کہ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) کا مفہوم سمجھ میں نہیں آئے گا بلکہ قرآنِ کریم کی یوں کہیے کہ پوری کی پوری تعلیم سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس کے متعلق عجیب قسم کے الجھاؤ پیدا ہوں گے‘ بعض اوقات کشمکش بھی پیدا ہوگی۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں سب سے پہلے دعا کا قرآنی مفہوم سمجھ لینا چاہیے۔ ممکن ہے میرے کہنے سے آپ احباب میں سے بعض کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ان میں سے کون ہے جو ’’دعا‘‘ کو نہیں سمجھتا‘ دعا تو ہم ہر روز خدا سے مانگتے ہیں‘ یہ وہ لفظ ہے جو اللہ کے ساتھ بار بار ہمارے ذہنوں میں‘ ہماری زبان پہ آتا ہے تو پھر اس کے لیے اتنی لمبی وضاحت کی کیا ضرورت ہے لیکن عزیزانِ من! جیسا کہ آپ پہلے دیکھ چکے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ جتنے بھی الفاظ اور اصطلاحات اس سے پہلے آئی ہیں‘ ان سب میں یہ بات تھی کہ ہمارے ذہنوں میں اس کے متعلق پہلے سے ایک مفہوم یا ایک تصور متعین تھا لیکن جب عربی زبان اور قرآنِ کریم کی رو سے اس کی وضاحت ہوئی تو یہ نظر آیا کہ ہمارا وہ تصور‘ نہ تو مفہوم

کے اعتبار سے، نہ اسی زبان کے اعتبار سے صحیح تھا اور نہ ہی قرآن کی تعلیم کے اعتبار سے۔ ان تصورات میں ایک تبدیلی پیدا ہوئی، ایک انقلاب آیا اور اسی طرح سے آپ دیکھیں گے کہ جب ''دعا'' کا قرآنی مفہوم سامنے آئے گا تو اس سے بھی آپ کے قلب ونگاہ کے اندر ایک انقلاب پیدا ہو جائے گا۔ ہمارے ہاں ''دعا'' مانگنے سے عام مفہوم یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے کسی مقصد کے حصول کے لیے بارگاہِ خداوندی میں التجا کرتا ہے۔ اسی کو خدا کے ہاں سے مراد مانگنا بھی کہا جاتا ہے۔ دعا کے اس مفہوم کے خلاف جو شکوک پیدا ہوتے ہیں اور جو اعتراضات اُبھرتے ہیں، میں پہلے انہیں سامنے لانا چاہتا ہوں۔ میں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ دعا کے تصور یا مسئلہ کا تعلق تقدیر سے بھی ہے۔ اسے میں نے اپنی تصنیف ''کتاب التقدیر'' [1] میں بھی تفصیل سے لکھا ہے اور پھر جستہ جستہ مقامات پر ''مطالب الفرقان'' [2] کی اب تک چھپنے والی کتب میں بھی، اس کی بعض تفاصیل آئی ہیں لیکن اس درس میں چونکہ یہ بات پہلی دفعہ آئی ہے، اس لیے جو کچھ میں نے وہاں تفصیل سے لکھا ہے، اسے یہاں سمیٹ کر، ملخصاً، آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

لفظ دعا کے متعلق عام طور پر پایا جانے والا تصور اور اس سے پیدا ہونے والی صورتِ حال:

میں نے ابھی ابھی یہ کہا ہے کہ جب دعا کا یہ مفہوم لیا جائے کہ ہم خدا سے کچھ مانگتے ہیں، کچھ چاہتے ہیں کہ وہ ہماری یہ طلب پوری کر دے تو اس کے خلاف کچھ شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ اعتراضات ابھرتے ہیں، سب سے پہلے میں انہیں سامنے لاتا ہوں۔ اگر عقیدہ یہ ہو کہ انسان کی زندگی میں جو کچھ ہونا ہے، اسے خدا نے پہلے سے لکھ دیا ہوتا ہے اور یہ قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے تو پھر دعا کے کچھ معنی ہی نہیں رہتے۔ مثلاً ایک شخص کے متعلق اگر پہلے سے طے شدہ ہے کہ اس نے اتنے دن بیمار رہ کر مر جانا ہے، اب اس کے لیے وہ خود، یا اس کے متعلقین لاکھ دوائیں کریں، قسمت کے لکھے میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ قسمت کے لکھے کے متعلق بھی تو عقیدہ یہ ہے کہ وہ خدا ہی کا طے کردہ، خدا ہی کا فیصلہ ہوتا ہے، خدا ہی نے تقدیر مقرر کی ہے، خدا ہی نے اس کی قسمت میں یہ لکھا ہے۔ اگر قسمت میں یہی لکھا ہے کہ ایک شخص اتنا بیمار رہے گا اور اس کے بعد مر جائے گا، تو پھر دوا کرنے سے کیا حاصل ہوگا اور اگر یہ کہا جائے کہ نہیں، دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے تو پھر یہ عقیدہ غلط قرار پائے گا کہ قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے۔ جو فیصلہ بدل سکتا ہے خواہ وہ دعا سے بدلے یا تدبیر سے، وہ اٹل نہیں کہلا سکتا اور اس کے ساتھ ہی اس عقیدہ کی رو سے خود اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی عجیب سا تصور سامنے آتا ہے کہ پہلے اس نے ایک بات کا فیصلہ کر دیا اور کہہ دیا کہ ہمارا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ اس کے بعد وہ انتظار کرنے لگا کہ اگر اس شخص نے یا اس کے متعلقین نے ہم سے درخواست کی، تو ہم اپنا فیصلہ

---

[1] کتاب التقدیر کا پہلا ایڈیشن اکتوبر 1971ء کو زیورِ طباعت سے آراستہ و پیراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ اس میں ''خدا کا تصور'' کے لیے دیکھئے ص:35 تا 51، اور ''دعا'' کے لیے دیکھئے ص:359 تا 390 ''کتاب التقدیر'' میں دنیا کے مشکل ترین مسئلہ کا، قابلِ فہم، بصیرت افروز، حل موجود ہے۔

[2] اس سے مراد ''مطالب الفرقان'' کی پہلی 6 جلدیں سورۃ الفاتحہ سے سورۃ ھود تک پرویزؒ (1903-1985) کی حیات میں ہی طبع ہو کر منظرِ عام پر آ چکی تھیں جبکہ اس سلسلہ کی ساتویں جلد جو سورۃ حجر تک کا مسودہ آپ کی زندگی میں ہی اکتوبر 1984ء میں صاحبِ فراش ہونے سے قبل مکمل ہو چکا تھا جو بعد میں پھر 1991ء میں شائع ہوا۔

بدل دیں گے اور اگر یہ خاموش رہے تو وہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔ سوچیے، عزیزانِ من! کہ خدا کے متعلق اس قسم کے تصور سے کس قسم کے اشکال پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ پہلے سے ہر بات طے شدہ نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ ہر معاملہ کا فیصلہ ساتھ کے ساتھ کرتا ہے تو اس سے اور بھی زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

عزیزانِ من! اس کی وضاحت ایک مثال سے کی جاتی ہے۔ مثلاً زید اور بکر کا باہمی مقدمہ ہے جس کا فیصلہ عدالت نے کرنا ہے۔ زید حق پر ہے اور بکر جھوٹا ہے۔ دونوں خدا سے دعا کرتے ہیں کہ فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان دونوں کی دعا قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ مقدمہ کا فیصلہ لامحالہ ایک ہی کے حق میں ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کس کی دعا قبول ہوگی۔ اگر کہا جائے کہ اس کی دعا قبول ہوگی جو زیادہ گڑگڑا کر دعا مانگے گا تو ہو سکتا ہے کہ بکر جو جھوٹا تھا، وہ زیادہ خشوع و خضوع سے دعا مانگے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا اس کی دعا قبول کرے گا خواہ وہ حق پر نہ ہی ہو۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ نہیں، خدا اس کی دعا قبول کرے گا جو حق پر ہے یعنی زید کی تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر زید دعا نہ مانگتا تو پھر کیا ہوتا۔ پھر خدا بکر کا ساتھ دیتا کیونکہ اس نے دعا مانگی تھی اور زید نے دعا نہیں مانگی تھی۔ اس لیے اس نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس قسم کے اعتراضات وارد ہو رہے ہیں اور اگر کہا جائے کہ خدا بہر حال حق بات کا ساتھ دے گا تو اول تو یہ چیز واقعہ کے خلاف ہے، ہمارے ہاں عدالتوں سے آئے دن ایسے فیصلے صادر ہوتے رہتے ہیں جو حق کے خلاف ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ کئی بے گناہ پھانسی کے تختے پر چڑھا دیئے جاتے ہیں لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ خدا حق کا ساتھ دیتا ہے تو اس صورت میں دعا کا پھر کوئی مطلب نہیں رہتا۔ حقدار دعا کرے یا نہ کرے، خدا بہر حال اس کا ساتھ دے گا اور جو حق پر نہیں وہ لاکھ دعائیں کرے، خدا اس کی سنے گا ہی نہیں۔

دعا کے ساتھ تدبر کا عمل بھی:

عزیزانِ من! اگر کہا جائے کہ خالی دعا نہیں بلکہ دعا کے ساتھ تدبیر بھی ضروری ہے اور دعا سے تدابیر کامیاب ہو جاتی ہیں تو اس سے پھر اور دشواری لاحق ہو جاتی ہے۔ مثلاً زید اور بکر دونوں تدبیر کرتے ہیں۔ بکر اس کے ساتھ دعا بھی کرتا ہے اور زید دعا نہیں کرتا تو کیا اس صورت میں بکر کی تدبیر کارگر ہو جائے گی کیونکہ اس نے دعا بھی کی تھی اور زید ناکام رہ جائے گا کیونکہ اس نے دعا نہیں کی تھی۔ یہ ہیں وہ اشکال جو ہمارے ہاں کے مروّجہ عقائد کی رو سے دعا کے سلسلے میں ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ اس سلسلے کی تھی۔ یہ ہیں وہ اشکال جو ہمارے ہاں کے مروّجہ عقائد کی رو سے دعا کے سلسلے میں ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے سامنے سورۂ بقرہ کی وہ آیت آتی ہے جسے دعا اور اس کی قبولیت کے ضمن میں بنیادی طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن جس کا غلط مفہوم ان دشواریوں میں اور بھی اضافہ کر دیتا ہے۔

سورہ بقرہ کی آیت نمبر 2.186 کا مروجہ ترجمہ اور اس سے پیدا ہونے والی دشواری

اگر آپ کے پاس قرآنِ کریم کا نسخہ ہے، تو آپ اس آیت کو خود سامنے لے آیئے۔ وہ آیت ہے: وَاِذَا سَاَلَكَ

عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ (2:186)۔اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ''اے رسول !جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کو سنتا اور اسے قبول کرتا ہوں۔'' اس ترجمہ کی رو سے دشواری یہ پیش آتی ہے کہ ہم روز دیکھتے ہیں کہ مظلوم و مقہور، غریب و نادار، بے کس و بے بس، اور مصیبت زدہ لوگ، دن رات گڑگڑا کر خدا سے دعائیں مانگتے ہیں لیکن ان کی مصیبت رفع نہیں ہوتی، ان کی ساری عمر ظلم و ستم سہتے، مصیبتوں میں، کٹ جاتی ہے۔لہٰذا اس امر واقع کی موجودگی میں یہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ خدا ہر پکارنے والے کی پکار سنتا اور اس کی دعا قبول کرتا ہے۔اس اعتراض کے جواب میں عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ سنتا تو سب کی ہے لیکن کرتا وہی ہے جو دعا مانگنے والے کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔لہٰذا اگر کسی کی دعا قبول نہیں ہوتی تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ جو کچھ ہوا ہے اس کے حق میں وہی بہتر تھا لیکن قطع نظر اس کے کہ ستم رسیدہ، مصیبت زدہ، برسرِ حق، مظلوم انسان کا اس سے حقیقی اطمینان نہیں ہو سکتا، بڑے دور رس نتائج کا موجب بن جاتا ہے۔ایک مظلوم انسان، ظالم کی دست درازیوں کے خلاف خدا سے دعا کرتا ہے اور اس کے بعد دیکھتا ہے کہ اس کی حالت ذرا بھی بہتر نہیں ہوئی بلکہ اس مستبد ظالم کے ظلم میں اور اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے تو مذکورہ بالا جواب کی رو سے اسے سمجھ لینا چاہیے کہ ظالم کا ظلم اس کے حق میں بہتر اور خدا کی منشا کے عین مطابق ہے، اس لیے اسے نہ اب اس کے مظالم کے خلاف لب کشائی کرنا چاہیے اور نہ ہی اس سے بچنے کی کوئی تدبیر سوچنا چاہیے۔

اس قسم کی غلط سوچ کا نتیجہ:

غور کیجیے کہ اس قسم کے عقائد ظالموں کو کس طرح بدلگام چھوڑ دینے کا موجب بن جاتے ہیں۔اس سے پہلے ان ظالموں کے خلاف مظلوموں کے دل میں کم از کم انتقام کے جذبات تو ابھرتے تھے اور ہو سکتا تھا کہ وہ ان کے دست ستم سے محفوظ رہنے کی کوئی تدبیر سوچ لیتے لیکن اس عقیدہ کے بعد تو صورت یہ ہو گی کہ مظلوم نہ صرف ظلم و زیادتی کو دل کے پورے سکون کے ساتھ برداشت کرے گا بلکہ ظالم کے حق میں دعائے خیر بھی کرے گا کہ وہ اس کے لیے بہتری کے سامان پیدا کر رہا ہے۔آپ نے دیکھا کہ مستبد قوتیں، محکوموں، زیر دستوں اور مظلوموں کے لیے کس کس قسم کے عقائد وضع کرتی رہتی ہیں تاکہ وہ انہیں ذبح بھی کریں اور یہ ان کے شکر گزار بھی ہوں۔

دعا کی قبولیت کے لیے خدا کے مقرب بندوں کے وسیلے کی تلاش

عزیزانِ من! اس سے بھی آگے بڑھیے تو یہ عقیدہ سامنے آتا ہے کہ خدا ہر ایک کی نہیں سنتا، وہ اپنے مقبول بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے۔اس عقیدے کا نتیجہ ہے کہ آپ کو ہر حضرت صاحب کے آستانۂ عالیہ پر مصیبت زدہ اور آفت رسیدہ لوگوں کا ہجوم دکھائی دیتا ہے جو گڑگڑا کر ہاتھ باندھے اور اکثر ان کے پاؤں چومتے درخواست کرتے ہیں کہ یا حضرت! میرے لیے دعا کیجیے، ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا، برباد ہو جاؤں گا اور یہ سلسلہ حضرت صاحب کی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا، ان کی

وفات کے بعد جسے یہ لوگ وفات نہیں بلکہ وصال کہتے ہیں' یعنی ان کا اپنے محبوب' خدا کے ساتھ جا کر مل جانا' تو ان کی وفات کے بعد' ان کے مزار شریف سے وابستہ ہو جاتا ہے' جہاں ان سے سجدوں میں گر گر کر التجائیں کی جاتی ہیں اور مرادیں مانگی جاتی ہیں۔ جب ان سے پوچھا جائے تو جواب میں کہا جاتا ہے کہ ہم گنہگار بندے ہیں' اس لیے ہماری خدا تک رسائی نہیں ہو سکتی' یہ حضرات مقربین بارگاہِ خداوندی ہیں' اس لیے خدا ان کی بات مانتا ہے۔ یہ عقیدہ بھی رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ قرآن کی وہ آیت بھی پڑھی جاتی ہے' جسے میں نے شروع میں بیان کیا ہے یعنی وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ (2:186) جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں' میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ خدا کے مقربین کی وساطت سے خدا تک درخواست پہنچانے کا یہ عقیدہ' ہمارے دورِ ملوکیت کی تخلیق ہے۔ اس دور میں ذہنوں میں یہ بٹھایا گیا کہ السلطان ظل اللہ علی الارض یعنی بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس قسم کا سایہ زمین پر دیکھا گیا اسی قسم کی اس کی اصل آسمان پر تصور کر لی گئی۔ اس کی رو سے' خدا کا جو تصور سامنے آتا ہے' ظاہر ہے یہاں کے بادشاہوں کی طرح' وہ شہنشاہ حقیقی بھی ایک آمرِ مطلق سمجھا جاتا ہے' نہ کسی قاعدے کا پابند' نہ قانون کا: جسے چاہا پکڑ لیا' جسے چاہا نواز دیا، جسے چاہا بخش دیا' جسے چاہا باندھ لیا۔

اسی سلسلے میں بادشاہ کا دربار سامنے آیا جس میں سب سے پہلے حاجب اور دربان کھڑے ملتے تھے' پھر اہل دربار میں سے مصاحب' امراء' وزراء اور پھر مقربین بارگاہِ سلطانیہ سامنے آتے تھے۔ کسی عام آدمی کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اپنی درخواست براہِ راست سلطان المعظم تک پہنچا سکے۔ اس کے لیے اسے مقربین کے وسیلے کی ضرورت پڑتی تھی۔ آج بھی یہی حالت ہے۔ دفتروں کے باہر بیٹھے ہوئے چپڑاسی (Peons) ہی ذریعے بنتے ہیں جس سے درخواست آگے جاتی ہے۔ بہرحال دورِ ملوکیت میں بادشاہ اور بادشاہ کے دربار کا اس قسم کا جو تصور سامنے آیا تو ہم نے یہی نقشہ دربارِ خداوندی کا متعین کر دیا۔ اس کی رو سے خدا تک بات پہنچانے کے لیے اس کے مقربین کی وساطت ضروری قرار پائی۔ یہ ہے وہ ضرورت جس کے پیشِ نظر خدا تک دعا پہنچانے کے لیے کسی حضرت صاحب کے وسیلے کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ ہماری درخواست بھی خدا تک پہنچاتے ہیں اور اس کے ساتھ سفارش بھی کرتے ہیں۔ اللہ ان کی بات مان لیتا ہے اور ہماری درخواست منظور ہو جاتی ہے۔ درخواست کے ساتھ کچھ نذر نیاز بھی دینی پڑتی ہے' بعینہٖ بادشاہوں کے حضور نذرانے گزارنا پڑتے ہیں یا ان کے مقربین کی خدمت کرنا پڑتی ہے۔

خدا کے متعلق ہمارا موجودہ تصور دورِ ملوکیت کا اور مرورِ زمانہ کا پیدا کردہ ہے:

یہ ہے عزیزانِ من! خدا کا وہ تصور جو ہمارے شہنشاہیت کے زمانے میں' ہمارے ذہنوں میں مرتسم کیا گیا اور جس نے رفتہ رفتہ مصدقہ عقائد کی شکل اختیار کر لی۔ مرورِ زمانہ کے یہ عقائد اس طرح ہمارے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو گئے کہ

اب اگر ان کے خلاف کوئی بات کہی جائے' تو اربابِ شریعت کی طرف سے اس پر کفر والحاد کے فتوے لگا دیئے جاتے ہیں اور دامانِ طریقت کے وابستہ افراد پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے کہ نہ معلوم حضرت صاحب کی طرف سے کیسا غضب نازل ہو جائے گا حالانکہ ان حضرات کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے کہ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (7:194) وہ تمہارے ہی جیسے انسان' خدا کے بندے ہیں۔ اور جن مزاروں پر جا کر مرادیں مانگی جاتی ہیں یا انہیں خدا تک بات پہنچانے کا واسطہ قرار دیا جاتا ہے' ان کے متعلق کہا کہ تم انہیں لاکھ پکارو' وہ تمہاری بات ہی نہیں سن سکتے اور اگر بالفرض محال وہ سن بھی لیں تو اس کا جواب ہی نہیں دے سکتے (35:14)۔ تم انہیں جو کچھ پکار پکار کر کہتے ہو وہ اس سے قطعاً بے خبر ہوتے ہیں (46:5)۔ انہیں تو خود اپنے متعلق بھی اتنا علم نہیں ہوتا کہ: اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (16:21) وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ جو اپنے حال سے بھی بے خبر ہیں' وہ تمہاری کیا سنیں گے اور تمہاری کیا مدد کریں گے!!

دعا کے اس پیچیدہ مسئلے کا ایک نہایت شافی اور متضاد کیفیات سے ماوراحل

اب آیئے اس سوال کی طرف کہ دعائیں قبول کن لوگوں کی ہوتی ہیں اور کس طرح ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے اسی آیت کو لیجیے جس کا ایک حصہ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں اور اس کی وضاحت میں' میں نے اتنا کچھ کہا ہے یعنی وہ آیت جس کے معنی تھے کہ جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہو کہ میں ان کے قریب ہوں' ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں' اس کے بعد ہے کہ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ (2:186) ان سے کہو کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری مانگ پوری ہو' تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم میری راہنمائی' میرے قوانین کی صداقت پر' پورا پورا یقین رکھو اور میری اطاعت کرو' میری باتوں کا جواب دو' اس طرح کامیابی کا صحیح راستہ تمہارے سامنے آ جائے گا۔ تم اسے یہ کہتے ہو کہ میں تمہاری بات کا جواب دوں تو خدا سے یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ میں تمہاری بات کا جواب دوں' لیکن پہلے تم میری باتوں کا تو جواب دو۔

دعا کی قبولیت کے سلسلہ میں قرآن کا تفصیلی جواب

یعنی وہ یہ کہ میں نے جو کچھ تم سے کہا تھا' بتاؤ تم نے ان کے متعلق کیا کیا۔ کیا ان پر عمل کیا؟ کیا اس کے مطابق چلے؟ پہلے اس بات کا جواب دو تو پھر میں تمہاری بات کا جواب دوں گا۔ غور فرمایا' عزیزانِ من! اسی کی وضاحت میں دوسری جگہ کہا کہ: وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (42:26) دعائیں قبول ان کی ہوتی ہیں جو ایمان لائیں اور اعمالِ صالحہ کریں یعنی ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی اور فطری نتیجہ کامیابی ہوتا ہے اور یہی دعا سے مقصود ہوتا ہے۔ ایک دوسرے مقام پر سورۃ المؤمن میں ہے کہ تم مجھے پکارو' میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا لیکن اتنی بات سن رکھو کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ (40:60) جو لوگ میری اطاعت سے سرکشی اختیار کریں گے' ان کی دعائیں قبول نہیں ہوں گی' وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

جو کچھ میں نے ابھی تک جستہ جستہ مقامات سے کہا ہے' سورۂ آل عمران کی تین چار مسلسل آیتوں میں اسے نہایت وضاحت سے' تسلسل کے ساتھ' بیان کیا گیا ہے۔ پہلی آیت (3:189) ہے۔ میں آیت قرآنِ کریم سے پڑھتا ہوں اور اس آیت کا مفہوم اپنے ''مفہوم القرآن'' سے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے پورے قرآنِ کریم کا مفہوم مرتب کیا ہوا ہے' اس کا نام بھی ''مفہوم القرآن'' ہے۔ تو یہ جو آیت میں پیش کروں گا' اس کا مفہوم' مفہوم القرآن ہی سے پیش کروں گا۔ آیت یہ ہے اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (3:190) جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں' ان کے لیے کائنات کی تخلیق' رات اور دن کی گردش میں قوانین خداوندی کی محکمیت اور ہمہ گیریت کی نشانیاں ہیں الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (3:119) ان صاحبانِ عقل و بصیرت اور اربابِ فکر و نظر کے لیے' جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے' بیٹھے' لیٹے' قوانین خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کے تخلیقی پروگرام پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں' اور اپنی تحقیقات کے بعد علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں ' کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگہۂ ہستی کو نہ تو عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لیے۔ تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ تو کسی شے کو بے مقصد اور بلاغرض و غایت پیدا کر دے۔ تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم علمی تحقیقات اور عملی تجارب کے بعد اشیائے کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح تباہ کن عذاب سے محفوظ رہیں۔ اب یہ ہے کہ: رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (3:192) جو قومیں اس قسم کی تحقیقات نہ کرنے سے' اشیائے کائنات کی نفع بخشیوں سے محروم رہتی ہیں' ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس جاتی ہیں اور وہ ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی ذلیل و خوار قوموں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں دنیا کی تباہی کے لیے استعمال نہ کیا جائے بلکہ نوع انسان کی ربوبیت عامہ کے لیے صرف میں لایا جائے۔ ایسا کچھ وہی قوم کر سکتی ہے جو خدا کی رہنمائی پر یقین محکم رکھے۔ لہٰذا ان اربابِ عقل و بصیرت کی پکار یہ ہوتی ہے کہ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۗ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ (3:193) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم نے ایک پکارنے والے کو یہ کہتے سنا کہ ''آؤ! اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کی صداقت پر ایمان لاؤ'' ہم نے اس کی دعوت پر لبیک کہا' اور خدا کے قانون کی صداقت پر ایمان لے آئے۔ اس کے بعد ان اربابِ علم و ایمان کے سینے میں اس قسم کی آرزوئیں بیدار ہوتی ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم سے اگر کوئی بھول چوک ہو جائے تو اس کے مضرت رساں نتائج سے ہمیں محفوظ رکھنا اور ہماری چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں اور تدبیری ناہمواریوں کے اثرات مٹاتے رہنا۔ اور ہمارا انجام ان لوگوں کی رفاقت میں کرنا' جن کے سامنے زندگی کی وسعت اور کشادگی کی راہیں کھل چکی ہوں۔ اگلی آیت ہے کہ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی

رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (3:194) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے ہم سے اپنے رسولوں کے ذریعے وحی کی رو سے، جن خوشگواریوں اور سرفرازیوں کا وعدہ کیا ہے، ان سے ہمیں بہرہ یاب کرنا۔ اور ایسا نہ کرنا کہ اعمال کے ظہورِ نتائج کے وقت ہم دنیا کی نگاہوں میں ذلیل وخوار ہو جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تو وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔ تیرا ہر قانون صحیح صحیح نتائج مرتب کر کے رہتا ہے۔

عزیزانِ من! دعائیں مانگنے والوں کی خصوصیات کو بھی آپ نے دیکھ لیا اور ان کی دعاؤں کو بھی۔ اب خدا کی طرف سے اس کا جواب سنیے۔ جواب یہ ہے کہ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ (3:195) خدا نے ان کی دعاؤں کا یہ جواب دیا کہ ہم نے تمہاری دعاؤں کو سن لیا ہے لیکن تم یاد رکھو! ہم کسی کام کرنے والے کی محنت کو ضائع نہیں کرتے، وہ مرد ہو یا عورت، ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے، عزیزانِ من! خدا کی طرف سے دعاؤں کا جواب اور ان کی قبولیت کی شرط۔

مومنین کی دعاؤں کی قبولیت کے بعد انبیائے کرام کی دعاؤں کی قبولیت کی نوعیت اور غایت

یہاں تک تو بات عام مومنین کی تھی۔ حضراتِ انبیائے کرامؑ کی دعاؤں کی قبولیت کی صورت بھی ملاحظہ فرماؤ کہ ان کی قبولیت کو خدا کن باتوں سے مشروط قرار دیتا ہے اور وہ کس طرح سے قبول ہوتی ہیں۔ دو تین مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔ حضرتِ نوحؑ کے متعلق، جب ان کی قوم نے ان کی سخت مخالفت کی تو کہا کہ وَلَقَدْ نَادٰىنَا (37:75) نوحؑ نے ہمیں پکارا اور اس کے بعد ہے کہ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ (37:75) اور ہم دعاؤں کا بہترین جواب دینے والے ہیں۔ ان کی اس دعا کا جواب کیا دیا گیا۔ ذرا غور سے سنیے، جواب تھا کہ فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا (23:27) ہم نے نوحؑ کی طرف وحی بھیجی۔ اس سے کہا کہ تم اس آنے والے طوفان سے بچنا چاہتے ہو، حفاظت چاہتے ہو، اس کے لیے تم نے ہمیں پکارا تھا اور اس پکار کا جواب ہم تمھیں دیتے ہیں۔ اور وہ جواب یہ ہے کہ تم ایک کشتی بناؤ۔ ہوسکتا ہے تم کہو کہ یہ ایک نئی سی چیز ہے، مجھے کشتی بنانی نہیں آتی، ہم بتائیں گے کہ کشتی کیسے بنائی جاتی ہے، ہمارے زیرِ نگرانی کشتی بناؤ، ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ لیکن کشتی بناؤ۔ اس طوفان سے حفاظت کی صورت یہی ہے کہ تم کشتی بناؤ، کشتی کے ذریعے سے حفاظت ہوگی۔ آپ دیکھ رہے ہیں، عزیزانِ من! نوحؑ نے پکارا۔ جواب ملا کہ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ (37:75) ہم بہترین دعاؤں کا جواب دینے والے ہیں اور جواب یہ دیا گیا کہ طوفان سے بچنا ہے تو اس کے لیے کشتی بناؤ۔

حضرت نوح کے بعد حضرت موسیٰ کا ذکرِ خیر اور پروگرام کی تکمیل کے لیے استقامت کی تاکید

آگے بڑھیے۔ جب حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ فرعون [1] کی طرف جائیں اور بنی اسرائیل کو اس کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائیں تو انہوں نے اس مہم کی سختی اور اس میں پیش آنے والے خطرات کے احساس سے خدا سے متعدد تائیدی اسباب

[1] فرعون کے متعلق دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن، سورۃ بنی اسرائیل۔ ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2004، ص:109 (فٹ نوٹ 1)

وذرائع کی دعا کی تاکہ وہ ان کی تقویت کا موجب بنیں۔ حضرتِ موسیٰؑ نے خدا سے یہ کچھ مانگا' اس کے جواب میں کہا کہ: قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى (20:36) اے موسیٰؑ! جو کچھ تم نے مانگا ہے' تجھے عطا کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خدا نے اس طرح کہہ دیا ہو کہ ہم نے تیری دعا قبول کر لی' تیری مانگ پوری کر دی' تو پھر کچھ کرنے کی ضرورت باقی ہی نہیں رہ سکتی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی ان سے کہہ دیا کہ: اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ (20:42) تم دونوں بھائی موسیٰؑ اور ہارونؑ فرعون کی طرف جاؤ اور یاد رکھو' جو پروگرام تمہیں دیا گیا ہے' اس کے بروئے کار لانے میں ذرا سی بھی سستی نہ کرنا۔ دعا کے قبول ہو جانے کی ضمانت بھی دی اور اس کے بعد یہ کہا کہ اسے تم نے بروئے کار لانا ہے اور اس میں ذرا سا بھی تغافل نہ برتنا' تساہل نہ کرنا۔ دوسری جگہ ہے کہ: قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (10:89) خدا نے کہا کہ میں نے تمہاری دعا کو قبول کر لیا: فَاسْتَقِيْمَا اب تم اس پروگرام پر جم کر کھڑے ہو جاؤ اور یاد رکھو' کبھی ان لوگوں کا اتباع نہ کرنا جو حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔ غور فرمایئے' عزیزانِ من! ایک نبی سے کہا جا رہا ہے کہ تمہاری دعا ہم نے قبول کر لی اور اس قبولیت کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ جو پروگرام تمہیں دیا جاتا ہے اس پر جم کر کھڑے ہو جانا' تمہارے پائے استقامت میں ذرا لغزش نہ آنے پائے اور اس کے بعد تم دیکھو گے کہ تمہیں کامیابی نصیب ہو جاتی ہے۔ یعنی فقط ان کی کامیابی نہیں ہو سکتی یہ پروگرام ہے جس پر عمل کرنا ہے اور نہایت استقامت سے اس پر عمل پیرا ہونا ہے۔

جن لوگوں کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں ان کی عملی زندگی کی حالت

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا' عزیزانِ من! کہ جن دعاؤں کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ ہم نے انہیں قبول کر لیا' ان کے سلسلوں میں بھی یہ تاکید کر دی کہ ان کی کامیابی کے لیے جن طبعی اسباب وذرائع کی ضرورت ہے' انہیں بہم پہنچایا جائے اور اپنے پروگرام پر ثبات واستقامت سے عمل پیرا ہوا جائے' یہ نہیں کہ دعا مانگ لی' خدا نے جواب دیا کہ ہم نے قبول کر لی اور پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ اس قسم کی دعاؤں کے متعلق سورۂ رعد میں کہا گیا ہے اور بڑے ہی محاکاتی انداز سے کہا گیا ہے کہ تم ذرا اس پیاسے کا تصور سامنے لاؤ جو اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے دریا کے کنارے کھڑا ہے۔ کیا اس شخص کی پیاس بجھ جائے گی؟ اس کی پیاس کبھی نہیں بجھے گی۔ جو آگے بڑھ کر پانی سے چلو بھرے اور اسے پی لے' پیاس اس کی بجھے گی۔ پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر کھڑے رہنے سے قیامت تک پیاس دور نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے کہا ہے کہ: وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (13:14) جو لوگ خدا کے اس قانون کی صداقت سے انکار کرتے ہیں ان کی دعائیں رائیگاں چلی جاتی ہیں۔ جو دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ کو پکارتا رہے' دریا کے کنارے پانی بہہ رہا ہے' کنارے پہ کھڑا ہے' دعا بھی مانگ رہا ہے' لیکن آگے بڑھ کر پانی نہیں پیتا۔ تو یہ کیا ہے؟ یہی کہ یہ خدا کے قانون سے انکار کر رہا ہے۔ خود پانی نہیں پی رہا۔ اس واسطے اس کی' پانی پینے کی یہ دعا' اس کی یہ طلب اور مانگ' قیامت تک پوری نہیں ہو سکتی۔

معاشرے کے مظلوم اور مصیبت زدہ لوگوں کے مصائب و آلام کے حل کے لیے نظام کی اہمیت اور اس کی افادیت

عزیزانِ گرامیِ قدر! اس مقام پر یہ کہا جائے گا کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ اپنی جگہ بجا اور درست لیکن سوال یہ ہے کہ کیا خدا کی خدائی میں مظلوموں اور مصیبت کے ماروں کی کوئی دادفریاد نہیں' ان کے دکھوں کا کوئی مداوا نہیں' ان کی پریشانیوں کا کوئی علاج نہیں' ان کی دعاؤں کا سننے والا کوئی بھی نہیں؟ قرآن ان سوالوں کے جواب میں کہتا ہے کہ ان کی دعائیں سنی بھی جاتی ہیں' قبول بھی کی جاتی ہیں' ان کی مدد بھی کی جاتی ہے' ان کے دکھ درد کو دور بھی کیا جاتا ہے لیکن اس کا طریقہ کچھ اور ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے۔ اسے غور سے سنیے' عزیزانِ من! برس ہا برس کی محنت شاقہ اور تگ وتاز وپیہم کے بعد مدینے میں جماعت مومنین کی اپنی مملکت قائم ہوگئی لیکن جو مسلمان ہنوز مکے میں محصور تھے' قریش کی طرف سے ان پر مظالم کا سلسلہ شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔ اس انتہائی بے کسی اور مظلومیت کے عالم میں انہوں نے خدا سے دعا کی کہ بارِالٰہا! ہماری مدد کر' اور ہمارے لیے ان ظالمین کے جور وستم سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت پیدا کر دے۔ انہوں نے خدا سے دعا کی اور آپ کو معلوم ہے کہ خدا نے کیا کیا؟ خدا نے وہاں کی جماعت مومنین سے کہا کہ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ (4:75) اے جماعت مومنین! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لیے نہیں اٹھتے ۔ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَآ أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا ۚ (4:75) کیا تم سنتے نہیں ہو کہ مکہ کے مظلوم ومقہور' بے کس و بے بس' کمزور وناتواں مرد عورتیں بچے کس طرح گڑگڑا کر ہم سے یہ فریاد کر رہے ہیں کہ بارِالٰہا! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے رہنے والوں نے اس قدر ظلم واستبداد پر کمر باندھ رکھی ہے۔ اے مملکت اسلامی کے علمبردارو! کیا تم ان کی ان دعاؤں کو سن نہیں رہے اور اگر سن رہے ہو تو پھر انتظار کس بات کا ہے' ان کی امداد کے لیے اٹھتے کیوں نہیں' تم نہیں سن رہے کہ وہ ہم سے کس نالہ وزاری سے کہہ رہے ہیں کہ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيرًا (4:75)، [1] ۔ وہ ہم سے فریاد کرتے ہیں۔

خدا کے لیے کیا مشکل تھا کہ وہ براہِ راست ان کی امداد کر دیتا اور انہیں دشمنوں سے نجات دلا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اس مملکت سے' اس حکومت سے' اس نظام سے کہا جو اس کے نام پر اس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لیے قائم ہوا تھا کہ کیا تم ان کی پکار کو سن نہیں رہے؟ اٹھو اور ان کی پکار کا جواب دو' ان کی مدد کے لیے آگے بڑھو۔ یہ ہے مظلوموں کی دعاؤں کے قبول ہونے کا صحیح طریقہ۔ یہی جماعت مومنین جو' اب مدینے میں تھی' تیرہ برس تک قریش کے بے پناہ مظالم کا تختۂ مشق بنی رہی۔ انہوں نے اس زمانے میں خدا سے کچھ کم دعائیں تو نہیں کی ہوں گی لیکن چونکہ اس وقت دنیا میں کوئی نظام ایسا نہیں تھا جو مظلوموں کی دادرسی کے لیے وجود میں آیا ہو' اس لیے ان کی مدد کا کوئی سامان نہ ہو سکا۔ ان سے کہا جاتا رہا کہ ہمت واستقلال

---

[1] اور ہمارے لیے' اپنی جناب سے کوئی محافظِ نگران' کوئی سرپرست اور مددگار بھیج دے۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ)

سے کام لے کر اپنے پروگرام پر جمے رہو۔ ایک دن تمہاری حکومت قائم ہو جائے گی تو ان تمام مشکلات کا حل خود بخود مل جائے گا۔ اس طرح تمہاری اپنی مشکلات ہی حل نہیں ہو جائیں گی بلکہ تم ان مظلوموں کی امداد کے قابل بھی ہو جاؤ گے جو ہم سے نصرت و اعانت کی دعائیں مانگیں گے۔

دیکھیے اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے دوسری جگہ کس بلیغ انداز سے بیان کیا ہے۔ فرمایا کہ: اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ (27:62) کہو کہ وہ کون ہے جو قلبِ مضطر کی دعائیں سنتا ہے اور ان کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو دُور کر دیتا ہے؟ کس طرح دُور کر دیتا ہے' اس کے لیے کہا کہ: وَیَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ (27:62) وہ تمہیں حکومت و مملک عطا کر دیتا ہے۔ یہ ہے طریق خداوندی جس سے مظلوموں کی مصیبتیں رفع ہوتی ہیں۔ آپ کو یہ معلوم ہی ہے کہ اس قسم کی حکومت بھی محض دعائیں مانگنے سے نہیں ملا کرتی۔ خدا نے یہ کہا تھا کہ یہ ایمان و اعمالِ صالحہ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ دوسرے مقام پر اسی جماعت مومنین کے متعلق کہا ہے کہ: وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ (42:38) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں' اس کے احکام و قوانین کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں' انہی کی روشنی میں اپنے امورِ مملکت باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں اور جو سامانِ زیست خدا نے انہیں دے رکھا ہو' اسے رفاہِ عامہ کے لیے کھلا رکھتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہاں بھی وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ ۪ (42:38) سے اشارا اسی نظامِ مملکت کی طرف ہے جسے دنیا سے ظلم اور ناانصافی دور کرنے کے لیے متشکل کیا جاتا ہے۔ یہی وہ طریق تھا جس سے بنی اسرائیل کو قومِ فرعون کے مظالم سے نجات دلائی گئی۔

انسانی زندگی کی نفسیات پر معاشرتی خرابیوں اور نظام کی تباہ کاریوں کے اثرات کا نتیجہ:

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ مظلوموں اور بے کسوں کو خدا سے دعا مانگنے کی ضرورت کہاں اور کب پیش آتی ہے؟ اس کی ضرورت اس غلط معاشرہ میں پیش آتی ہے' جہاں کوئی بات قاعدے اور قانون کے مطابق نہ ہوتی ہو' جہاں ہر جگہ دھاندلی ہو رہی ہو' جہاں حقدار کو اس کا حق نہ مل سکتا ہو' جہاں مظلوم کی مدد کرنے اور ظالم کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہ ہو' جہاں اس شخص کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے' جہاں غنڈہ گردی ایسی ہو کہ شریف انسانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو جائے' جہاں افراتفری اور نفسانفسی کا یہ عالم ہو کہ جو کہیں اتفاق سے گر جائے سب اسے روندتے ہوئے آگے بڑھ جائیں' کوئی اس کے اٹھانے کی فکر نہ کرے' جہاں کسی کو اس کا خیال نہ ہو کہ کس کے بچے بھوکے ہیں اور کس کے تن پر کپڑا نہیں' جہاں مختلف مریض اس لیے بن آئی موت مر جائیں کہ ان کے پاس علاج کے لیے پیسہ نہیں تھا اور بیوہ ماں اپنے جوان بیٹے کی موت پر اس فکر میں گھلی جا رہی ہو کہ اس کا گور و کفن کیسے مل سکے گا اور اب میرا کیا بنے گا۔ یہ ہے وہ معاشرہ' جہاں بے کسوں اور ناداروں کو قدم قدم پر خدا سے دعائیں کرنا پڑتی ہیں کہ اس کے سوا ان کے سامنے امید کا کوئی اور سہارا نہیں ہوتا۔ یہی ہے وہ معاشرہ جس سے متاثر ہو کر کسی کہنے والے نے کہا تھا کہ

جو نہیں آشنا مصیبت کا درد و غم کا نہ جو شکار ہوا
جس پہ کوئی کبھی نہ وقت پڑا جو نہ اٹھ اٹھ کے رات کو رویا
وہ نہیں جانتا دعا کیا ہے اسے معلوم کیا خدا کیا ہے

لیکن جب معاشرہ صحیح خطوط یعنی مستقل اقدارِ خداوندی پر متشکل ہو تو اس میں ہر بات کا فیصلہ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے، ہر حقدار کو اس کا حق ملتا ہے اور بغیر کسی پریشانی اور تردد کے ملتا ہے، نہ کسی پر کوئی ظلم ہوتا ہے نہ دھاندلی۔ اس میں ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی مملکت کی طرف سے پوری ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس لیے اس میں نہ کوئی محتاج ہوتا ہے، نہ بے نوا۔ اس میں نہ کوئی اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے، نہ بے سہارا۔ ایسے معاشرے میں کسی کو خدا سے وہ کچھ مانگنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی جس کے لیے ہم قدم قدم پر اپنے آپ کو محتاج اور لاچار پاتے ہیں اور خدا سے التجائیں کرتے ہیں۔

اس کسمپرسی اس محتاجی اور اس بیچارگی کے علاج کے لیے حضرت عمر فاروق کا فرمان

عزیزانِ من! اس حقیقت کبریٰ کو حضرتِ عمر فاروقؓ (581-644/45AD) نے ایسے بلیغ اور عمیق انداز میں بیان کیا ہے کہ جوں جوں انسان اس پہ غور کرتا ہے، روح وجد میں آ جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ لوگو سن رکھو مجھے خلیفہ کیوں بنایا گیا؟ مجھے خلافت کا فریضہ اس لیے سونپا گیا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک پہنچنے سے روک دوں۔ اللہ اکبر! کتنی بلند حقیقتیں اس ایک جملے میں چھپی ہیں! کتنی بلند حقیقت ہے جسے اس قدر سادہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے! مطلب یہ کہ قیامِ خلافت کا مقصد یہ ہے کہ کسی ضرورت مند کی کوئی ضرورت رُکی نہ رہے۔ جب یہ ہوگی تو پھر کسی شخص کو اپنی ضروریات کے لیے خدا سے دعا کرنے کی حاجت ہی نہیں رہے گی اور اگر کوئی شخص اپنی کسی ضرورت کے لیے خدا سے دعا کرتا پایا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنے فریضے کی سرانجام دہی میں قاصر رہا ہوں اور وہ میرے خلاف گویا خدا سے شکایت کر رہا ہے۔ اس لیے مجھے فوراً احتساب خویش کرنا ہوگا اور اس امر کی کوشش کرنا ہوگی کہ میری شکایت بارگاہِ خداوندی تک نہ پہنچنے پائے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ضرورت مند کی ضرورت اس کے مانگنے سے پہلے ہی پوری ہو جائے۔ لہٰذا تم اپنی ضروریات اور اپنی احتیاجات کے لیے خدا سے براہِ راست دعا کرنے کی بجائے اسے مجھ تک پہنچایا کرو۔ یہاں وہ پوری ہو جائیں گی، تمہاری دعا کے خدا تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی، البتہ جب یہاں ضرورت پوری نہ ہو اور اگر ایسا وقت آ جائے تو میں اس سے پیشتر اس خلافت کے منصب سے الگ ہو جاؤں گا۔ یہ ہوتی ہے، عزیزانِ من! اس معاشرہ کی کیفیت جو وحی کی رہنمائی میں متشکل ہوتا ہے۔ اس میں کسی کو اپنی انفرادی ضروریات کے لیے خدا سے کچھ مانگنا نہیں پڑتا۔ جسے سب کچھ از خود مل رہا ہو، اسے مانگنے کی ضرورت کیا ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں مومنین کی جس قدر دعائیں مذکور ہیں وہ اجتماعی ہیں، انفرادی نہیں ہیں اور یہ اجتماعی دعائیں مانگی ہی اس مقصد کے لیے جاتی ہیں کہ ان کے ہاتھوں سے وہ نظام قائم ہو جائے جس میں کوئی مصیبت زدہ مظلوم نہ ہو، جس میں عالم گیر انسانیت کے مصائب اور آلام کا علاج ہوتا چلا جائے گا۔ یہ ہیں وہ دعائیں جو جماعت مومنین خدا سے مانگتی

ہے۔ اجتماعی دعائیں ایک فرد کے لیے نہیں اور یہ جو آیت ہمارے زیرِ نظر ہے' اس میں بھی کہا گیا ہے کہ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (1:4) ہم تجھ سے استعانت چاہتے ہیں۔

آخر کار سوال یہ کہ بیماری میں دعائیں کرتی کیا ہیں یا ان کا نتیجہ کیا نکلتا ہے

یہ سب کچھ کہنے کے بعد بھی ایک اہم سوال سامنے آتا ہے کہ دعائیں انفرادی ہوں' اجتماعی ہوں سوال یہ ہے کہ ان سے بال آخر ہوتا کیا ہے' ان کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور غور سے سمجھنے کے قابل۔ اس لیے کہ یہی وہ محور ہے جس کے گرد دعا کا سارا مسئلہ گردش کرتا ہے۔ دعا سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے ساتھ ہی جو کچھ قرآنِ کریم نے کہا ہے' اس کے معنی یہ ہیں کہ دعا کے بعد اس پروگرام پر عمل پیرا ہونا بھی ضروری ہے جس سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہے۔ پھر اس میں جو ''دعا'' درمیان میں آتی ہے اس کا مقصد کیا ہے' کیا وہ بیکار ہے؟

یہ بڑی اہم چیز ہے اور اسے غور سے سنیے کہ اس کی اہمیت کیا ہے؟ دنیا میں کوئی کام کرنا ہو' تو اس کے لیے سب سے پہلے ہمارے دل میں آرزو ابھرتی ہے۔ اسے پھر دہرا دوں کہ دنیا میں کوئی کام کرنا ہو' اس کے لیے سب سے پہلے ہمارے دل میں آرزو پیدا ہوتی ہے' ایک تقاضا بیدار ہوتا ہے۔ دنیا میں عمل کی بنیاد آرزو ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں

مازِ تخلیقِ مقاصد زندہ ایم

دنیا میں ہر عمل کی بنیاد آرزو کی رہینِ منت ہوتی ہے

ہماری زندگی کا ثبوت یہ ہے کہ ہم مقاصد کی تخلیق کرتے چلے جائیں اور اس کے بعد

از شعائے آرزو تابندہ ایم

ہماری زندگی میں نورانیت اور چمک اس سے پیدا ہوتی ہے کہ اس کے لیے آرزو بیدار ہو۔ یہ شعائے آرزو ہے کہ جس سے ہماری زندگی روشن ہوتی ہے۔ جس قدر یہ آرزو شدید ہوگی اسی قدر ہمارا ارادہ مستحکم ہوگا اور جس قدر ارادہ مستحکم ہوگا' اسی نسبت سے ہم اس مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کریں گے۔

علامہ اقبالؒ (1877-1938) نے بچوں کے لیے ایک نظم [1] لکھی ہے جسے ہم ابتدائی مدارس (Schools) کے ہر طالب علم کی زبان سے ہر روز سنتے ہیں۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دعا کے سلسلہ میں علامہ اقبال کی یہ نظم نفسیاتی تبدیلی کو بدلنے کی ایک بنیاد ہے:

اس شعر کے پہلے مصرعے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ یوں تو بچوں کے لیے ہے لیکن اس میں جو حقیقت بیان ہوئی ہے' وہ

[1] اقبالؒ: بچے کی دعا (ماخوذ) بانگِ درا' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص: 48-47

بڑی عمیق ہے یعنی جب انسان کی دلی تمنا حروف اور الفاظ کی شکل میں زبان پر آتی ہے' تو اسے دعا کہا جاتا ہے: جتنی گہری تمنا' اتنی ہی مخلص دعا' جتنی شدید آرزو اتنی ہی پرکیف پکار' دعا۔ نفسیات کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ آرزوؤں کی بیداری سے انسان کے اندر کس کس قسم کی نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے پھر جس قسم کی وہ آرزو اسی قسم کی نفسیاتی تبدیلی۔ اس نفسیاتی تبدیلی سے انسان کا زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ زاویہ نگاہ کی تبدیلی سے خارجی دنیا میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ اقبالؒ ہی کے الفاظ میں ہے کہ

قیمت ہر شے زِ اندازِ نگہ

ہر شے کی قیمت نگاہ کے انداز سے ہے۔ نگاہ کا زاویہ بدل لو' اس کی دنیا بدل جائے گی۔

ہر شے کی قیمت آرزو کے بدلنے میں ہی مضمر ہے

ساری دنیا ''من'' کی دنیا ہے:

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں' دنیا مرا دل ہے بدل جانے سے اس کے، رنگ ہر اک چیز کا بدلا

دوسرے ایک شعر میں ہے کہ

نہ کلی ہے وجہ نظر کشی' نہ کنول کے پھول میں تازگی فقط ایک دل کی شگفتگی' سببِ نشاطِ بہار ہے ❶

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ انسان کی شدت آرزو سے اس کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی (Psychological Change) پیدا ہو جاتی ہے جو اس کا اندازِ نگاہ بدل دیتی ہے اور اس کی آرزو میں جس قدر ارتکاز پیدا ہوتا ہے اسی قدر اس میں توانائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ جو اقبالؒ ❷ (1877-1938) نے کہا تھا کہ ''عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام'' وہ شدت آرزو کی ہی پیدا کردہ توانائی کی رو سے ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک آرزو کا معیار

آرزو کے سلسلے میں دو باتیں بنیادی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ آرزو کس قسم کی ہے؟ انسان کے دل میں مختلف آرزوئیں پیدا ہوتی رہتی ہیں لیکن قرآن مومن کے سامنے صحیح آرزو کا جو معیار رکھتا ہے' وہ یہ ہے کہ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ

---

❶ پرویزؒ (1903-1985) نے اپنی کتاب ''انسان نے کیا سوچا؟'' کے پہلے ایڈیشن میں خارج میں نہ بہار ہے نہ خزاں' نہ نغمہ ہے نہ فغاں' لکھنے کے بعد یہ شعر اسی طرح سے درج کیا ہے۔ سچ کہا تھا پروفیسر وائٹ ہیڈ نے اپنی کتاب Science and the modern world میں کہ 'نہ پھول اپنی مشام جاں نواز کے لیے درخورِ تحسین ہے' نہ عندلیب اپنے نغمہ دل ربا کے لیے۔ اور نہ آفتاب جہانتاب اپنی نور افگنی کے لیے کسی تعریف و توصیف کا مستحق ہے..... اپنے قصائد کا ممدوح خود اپنے ''دل'' (Mind)) کو قرار دینا چاہیے۔ فطرت تو یکسر بے آب و رنگ واقع ہوئی ہے۔ نہ اس میں چنگ و رباب ہے' نہ رنگ و شباب۔ یہ سب کچھ ہمارے اپنے اندر ہے۔'' ''حواس (Senses)) ذریعہ عمل'' ہیں ''دل (Mind)) کی دنیا'' کے لیے۔ انسان نے کیا سوچا؟ کے پہلے ایڈیشن کے صفحات 102 تا 104 پڑھیے۔ ❷ بالِ جبریل: عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۹﴾ (81:29) تمہیں اس کا اختیار ہے کہ جو جی میں آئے‘ اسے چاہو‘ لیکن مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ وہی چاہے‘ جو خدا چاہتا ہے اور اس طرح اپنی آرزوؤں کو مشیت خداوندی سے ہم آہنگ رکھے۔ جس بات کو خدا نے برا قرار دیا ہے‘ تم بھی اسے برا سمجھو۔ جسے اس نے اچھا کہا ہے تم بھی اسے اچھا سمجھو۔ تم ویسا بننے کی کوشش کرو جیسا خدا چاہتا ہے کہ تم بن جاؤ۔

قرآنِ کریم کے متعلق اقبالؒ (1877-1938) نے کہا ہے کہ

آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

یہ تمہیں وہ کچھ بنا دے گا جو خدا چاہتا ہے کہ تم بن جاؤ۔ لہٰذا سب سے پہلے پہلا ضروری مرحلہ یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ جو آرزو ہمارے دل میں پیدا ہو رہی ہے‘ وہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر یہ ویسی نہ ہو تو اسے تبدیل کر کے مستقل اقدار سے ہم آہنگ کر لینا چاہیے۔ تو اس کے اندر پہلی چیز تو یہ آئی۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ دل میں صرف آرزو کی بیداری سے مقصد حاصل نہیں ہو جاتا۔ آپ کسی جگہ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں‘ آپ کے دل میں وہاں جانے کی آرزو بیدار ہوتی ہے۔ اب اس کے بعد اگر آپ اسی طرح گھر میں بیٹھے رہیں‘ تو آپ اس منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ پائیں گے۔ اس کے لیے اگر آپ کو ریل میں جانا ہے تو ریلوے ٹائم ٹیبل کنسلٹ کرتے ہیں‘ گاڑیوں کے اوقات دیکھتے ہیں‘ انکوائری والوں سے دریافت کرتے ہیں‘ پھر مقررہ وقت‘ اور مقررہ تاریخ پر گھر سے چلتے ہیں‘ اسٹیشن پر پہنچتے ہیں‘ ٹکٹ خریدتے ہیں‘ گاڑی کا انتظار کرتے ہیں‘ صحیح گاڑی میں بیٹھتے ہیں‘ جو گاڑی سامنے آ جائے اسی میں نہیں بیٹھ جاتے‘ جو گاڑی آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچانے والی ہے اس میں بیٹھتے ہیں اور یہ وہ گاڑی ہے جو آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچاتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ دل میں کسی جگہ پہنچنے سے یا آرزو کے بیدار ہونے سے‘ اور وہاں تک پہنچنے کے درمیان یہ جتنے مراحل آتے ہیں‘ وہ سارے اس پروگرام کا حصہ ہوتے ہیں کہ جس سے اس آرزو کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہی آرزو‘ ایسی آرزو ہے جو اس مقصد تک پہنچانے کے لیے دل میں اٹھے۔ یہ خدا نے مستقل اقدار کی رو سے آپ کے لیے‘ انسان کی اپنی ذات کی نشوونما اور عالمگیر انسانیت کی نشوونما کے لیے‘ مقرر کیا ہے۔ یہ آرزو بیدار ہو اور پھر اس کے لیے وہ تمام اسباب اور سامان اکٹھا کیا جائے جو اس کے لیے متعین کیا گیا ہے اور اس کی ہدایت کے مطابق اس گاڑی میں سوار ہوا جائے جو آپ کو اس منزلِ مقصود تک پہنچا دے گی۔

داخلی تبدیلی کے بغیر خارجی تبدیلی ممکن ہی نہیں

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ ’’دعا‘‘ سے انسان کے اپنے اندر ایک نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی کا پیدا ہونا بڑی اہم چیز ہے۔ کس قدر قابلِ رشک ہے وہ انداز‘ جس میں اقبال (1877-1938) نے اتنی بڑی‘ بلند‘ عمیق‘ دقیق حقیقت کو دو مصرعوں میں واشگاف کر دیا ہے! میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بلیغ اور دل کش انداز تصور میں نہیں آ سکتا۔ آپ بھی سنیے اور میری طرح وجد میں آ جائیے۔ وہ کہتا ہے کہ

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی

یہاں ’’قضا‘‘ سے مراد ’’قانونِ خداوندی‘‘ ہے:

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

کیا بات ہے! کیا کہہ گیا!! اسی کے ساتھ دوسرا شعر ہے کہ

تری دعا ہے کہ ہو آرزو تری پوری مری دعا کہ تری آرزو بدل جائے

کہا کہ تیری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی، مگر اس سے یہ ممکن ہے، کہ تو بدل جائے اور یہ جو تبدیلی ہے کہ تو بدل جائے، وہ قرآنِ کریم کے اندر ڈوبنے سے یعنی اپنی آرزوؤں کو اس کے قوانین سے ہم آہنگ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ قرآن کے متعلق اقبال نے کیا کیا کچھ کہا ہے!! کہ

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود

یہ جب دل کی گہرائیوں کے اندر اتر جاتا ہے تو جہاں دیگر شود۔ اور انسان کے اندر جب وہ تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے تو خارج میں خود بخود تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ خارجی انقلاب آ ہی نہیں سکتا جب تک انسان کے اندر داخلی انقلاب پیدا نہ ہو اور یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآنِ کریم نے بڑے ہی بلیغ الفاظ میں کہا کہ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ (13:11) یاد رکھو! تم تو ایک طرف، ساری دنیا بھی زور لگا کر دیکھ لے کسی قوم کی حالت میں کبھی تبدیلی نہیں آ سکتی تاوقتیکہ اس قوم کے پہلے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا ہو۔ اس کی خارج کی تبدیلی کا دارومدار اس کی داخلی تبدیلی کے اوپر ہے، اس کی نفسیاتی تبدیلی کے اوپر ہے اور یہ ہے جو ''دعا'' سے حاصل ہوتی ہے۔ اس چیز سے انسان کے اندر ایک داخلی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔

عزیزانِ من! یہ ہے، دعا کی اہمیت اور غایت۔ میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ انسان کی ہر کوشش یا عمل کا آغاز اس کے دل میں پیدا ہونے والی خواہش یا آرزو سے ہوتا ہے۔ یہی آرزو شدید ہو کر ارادہ بنتی ہے اور ارادہ کے مستحکم ہونے کے بعد اس مقصد کے حصول کے لیے قدم اٹھتا ہے۔ قدم اٹھانے کا مرحلہ بڑا اہم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی بڑا نازک بھی۔ آپ گھر سے کسی جگہ جانے کا ارادہ لے کر نکلتے ہیں، اس جگہ پر پہنچنے کے لیے سب سے پہلی اور لاینفک شرط یہ ہے کہ آپ صحیح راستہ پر گامزن ہوں۔ اگر آپ کا قدم غلط راستہ پر پڑ گیا تو آپ مسافت بھی طے کریں گے جس میں آپ کا وقت اور توانائی بھی صرف ہو گی لیکن آخر الامر ہو گا یہ کہ نہ صرف آپ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکیں گے بلکہ آپ اس سے بہت دور ہٹ چکے ہوں گے۔ لہٰذا جب آپ نے وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (1:4) کہہ کر خدا سے منزلِ مقصود تک پہنچنے کی آرزو کا اظہار کیا اور اس کے لیے اس کے اعانت طلب کی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ نے سب سے پہلے یہ چاہا کہ اس منزل تک پہنچنے کا صحیح یا سیدھا راستہ آپ کے سامنے آ جائے۔ اس کے لیے آپ کے دل کی آرزو یہ دعا بن کر آپ کے لبوں تک آئی کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ (1:5) ہمیں اس سیدھے راستے کی راہنمائی مل جائے جو ہمیں منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ یہ سورۃ الفاتحہ کی اگلی یعنی پانچویں آیت ہے اور اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

(باب ششم مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ الفاتحہ، مطبوعہ ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور جنوری 2007ء)

محمد انوار خان، اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ پاک، رسول پاک، قرآن پاک

ویسے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ننانوے سے بھی کہیں زیادہ اسماء الحسنیٰ ہیں لیکن ہم اپنی روزمرہ زندگی میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے نام کے ساتھ لفظ پاک کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جب ذکر خیر ہو تو ہماری زبان سے بے اختیار نبی پاک نکلتا ہے بلکل اسی طرح جب ذکر ہو قرآن حکیم کا تب بھی ہمارے لبوں سے لفظ قرآن پاک ہی نکلتا ہے لہٰذا لفظ پاک ہمارے دین کا جزو لاینفک ہے یعنی ہمارا اللہ پاک ہمارا نبی پاک ہماری کتاب پاک۔ چنانچہ ایسا اسم جو کسی خاص شخص، جگہ یا چیز کے لیے بولا جائے اسم معرفہ کہلاتا ہے جس سے ہمارے دین کی پاکیزگی بیاں اور عیاں ہو جاتی ہے۔

پچھلے دنوں ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب کی سرکاری سرپرستی میں پاکستان آمد پر ان کے متعدد نئے اور پرانے بیانات میڈیا اور سوشل میڈیا کی زینت بنے رہے۔ ان کا ایک بیان جو کہ 2017 میں پہلی بار نشر ہوا تھا میری نظروں سے بھی گزرا یہ بیان امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صحیح حدیث نمبر 5686 کا حوالہ دیتے ہوئے کیا گیا تھا۔ یقیناً ان کا متذکرہ بیان کئی سال قبل نشر ہوا تھا مگر میں اپنی کوتاہ بینی کے باعث ان کا یہ بیان دیکھنے اور سننے سے قاصر رہا۔ البتہ ڈاکٹر صاحب کا بیان سننے کے بعد جو وساوس روایات کے حوالے سے گزشتہ اور موجودہ دینی علماء کرام کے بارے میں میرے ذہن کے گوشوں میں پوشیدہ تھے اور جنہیں میں کبھی زیر لب لانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن آج ربّ کعبہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی احیاء کی خاطر کہنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ جن معتبر ہستیوں اور عظیم فقہاء کرام کا ڈاکٹر صاحب نے بطور حوالہ ذکر فرمایا اور جن مستند روایات کی روشنی میں ڈاکٹر ذاکر نے بشمول اونٹ تمام حلال پرندوں اور جانوروں کے پیشاب اور فضلوں کو طاہر اور حلال قرار دے دیا تو مجھ جیسا کم علم شخص بھی یہ بات سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اب تو پیچھے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اس امر بے معنی کی تصدیق کے لیے دلیلیں دی جا رہی ہیں اور صحیح احادیث کے حوالے بھی موجود ہیں مگر مجھ گنہگار کا دل ہے کہ کسی طور ان مخصوص روایات کو صحیح ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک طرف تو ہمارا پاکیزہ اور منزہ دین کہتا ہے کہ صفائی نصف ایمان ہے یعنی صرف پاک و صاف رہنے پر ہمیں سو میں سے پچاس نمبر مل جاتے ہیں تو دوسری جانب یہ کیسے ممکن ہے کہ حلال جانوروں کے پیشاب اور پاخانہ کو طاہر اور مسلمانوں پر اس نجس شے کا استعمال جائز قرار دے دیا جائے۔ البتہ جو خصوصیات ڈاکٹر صاحب نے گوگل پر

سرچ کرنے کے بعد اونٹ کے پیشاب کی بیان کی ہیں کم وبیش یہ تمام خصوصیات تو شراب میں بھی پائی جاتی ہیں جبکہ شراب سو فیصد حلال پھلوں اور اناج سے کشید کی جاتی ہے۔ لہٰذا جب ہمارا پاکیزہ اور منزہ دین پھلوں سے کشید کی گئی شراب کو بھی حرام قرار دے دیتا ہے کیونکہ شراب کی تیاری کے وقت پھلوں اور اناج کو گلایا سڑایا جاتا ہے جس کے نتیجے میں ان پھلوں اور اناج سے شدید بدبو پھیلتی ہے اور یقیناً اس کے استعمال کے بعد انسان اپنا ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے ایسے میں یہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے کہ ایک نہایت بدبودار حیوانی پیشاب کو حواسِ خمسہ کے ہوتے ہوئے ایک مسلمان پر جائز حلال اور صحت بخش قرار دے دیا جائے۔

ایسے میں میرے دودھ سے زیادہ سفید، پاک وصاف اور شفاف دین کو ان چند ضعیف روایات اور موضوع احادیث نے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے آلودہ کر کے کس نہج پہ پہنچا دیا کہ اب ہم ان ہندوؤں کے ہم پلّہ کھڑے ہو گئے ہیں جو گائے کا پیشاب پیتے ہیں اس کو اپنے لیے پوتر سمجھتے ہیں اور بہت سی بیماریوں کا علاج بھی قرار دیتے ہیں۔ کل تک ہم ان کے اس غلیظ نا پاک اور غیر انسانی رویے پر ان کو لعنت ملامت کرتے تھے آج ہمارے اکابرین موضوع احادیث اور روایات سے ان اقوال کو صحیح ثابت کرنے میں کوشاں ہیں کہ حلال جانوروں کا پیشاب اور پاخانہ جائز اور حلال ہے۔ یہاں صرف اونٹ پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ تمام حلال پرندوں اور جانوروں جن کا گوشت ہم کھاتے ہیں ان کا پیشاب اور پاخانہ بھی ان فقہاء کرام کی نظر میں ضرورت کے تحت استعمال کرنا جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ بسا اوقات تو لگتا ہے کہ عالم اسلام کے تمام مسائل حل ہو چکے ہیں شاید اسی بناء پر ہمارے علماء ومشائخ اس بحث میں سرگرداں و پریشاں ہیں کہ حلال جانوروں کا پیشاب اور پاخانہ جائز ہے یا ناجائز جبکہ آج انسانوں کو درپیش تمام بیماریوں کے علاج کے لیے بے شمار ادویات طویل ریسرچ کے بعد دنیا کے چپے چپے میں باآسانی دستیاب ہیں۔ لیکن شومئ قسمت امت مسلمہ نے اپنی تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا ہزاروں سال گزرنے کے باوجود ہمارے علماء کرام آج بھی انہی فروعی معاملات میں الجھے ہوئے ہیں۔ ایک واقعہ جو ہم بچپن سے پڑھتے اور سنتے چلے آرہے ہیں کہ ہلاکو خان نے جب بغداد پر حملہ کیا تو وہاں کے علماء اس بحث میں مصروف تھے کہ کوّے کو کھانا حلال ہے یا حرام، نہیں معلوم کہ یہ واقعہ حقیقت پر مبنی ہے یا صرف حکایت ہے بہرصورت قوموں کے زوال کی طرف ایک سچا اور تلخ اشارہ ضرور ہے۔ جب قوموں کے علماء ومشائخ ان بے معنی باتوں پر زیادہ دھیان دیں اور فضول بحثوں میں پڑ جائیں، مسائل کا تجزیہ اور انہیں حل کرنے کی کوشش کے بجائے مسائل بڑھانے والی لایعنی بحثوں میں الجھ جائیں تو ہلاکو خان تو درکنار کوئی بھی ایسی بدبخت قوم پر باآسانی تسلط حاصل کرسکتا ہے۔

جیسا کہ تمام صاحب علم حضرات اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کے جمع کرنے کا کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے تقریباً اڑھائی سو سال بعد شروع ہوا اور اس کارِ خیر میں جن عظیم عالم دین ہستیوں نے حصہ لیا ان کے اسماء گرامی اور ان کی تحریر کردہ کتب کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ، سنن ترمذی، سنن نسائی ان تمام قابل قدر ہستیوں کا تعلق فارس یعنی

موجودہ ایران سے تھا جنہوں نے ان احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو تحریری دستاویزات میں متشکل فرمایا کیونکہ اس سے پہلے کوئی بھی کتاب حدیث مبارکہ تحریری شکل میں موجود نا تھی ان تمام قابل قدر حضرات میں سے ایک بھی عالم دین عربی النسل نہیں تھا۔ عین ممکن ہے کہ میرے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض سے شفاء حاصل کرنے کے لیے صرف اونٹنی کے پاک وصاف دودھ کو پینے کا حکم دیا ہو اور راوی سے یا کاتب حدیث سے سَہْواً اس میں اونٹ یا اونٹنی کے پیشاب کا اضافہ ہو گیا ہو کیونکہ یہ تمام تر کاوشیں تو انسانی ہیں جس میں خطاء کے امکان کو یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ قرآن کریم وحی الٰہی کا وہ واحد مجموعہ ہے جس کے ایک ایک حرف کی سچائی کی ذمہ داری خود خدا نے اپنے ذمہ لی ہوئی ہے جیسا کہ دودھ کی پاکیزگی کے متعلق گواہی بھی موجود ہے جس کی شہادت ہمیں قرآن پاک سے مل جاتی ہے ارشاد خداوندی ہے:

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝

(سورۃ المومنون، آیت:21)

اسی طرح اگر تم اپنے مویشیوں پر غور کرو گے تو ان میں بہت سی ایسی باتیں ملیں گی جن سے تمہارا ذہن کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔ تم سوچو کہ ان کے پیٹ میں بالآخر ہوتا کیا ہے؟ کیا اس میں کوئی بھی ایسی چیز ہوتی ہے جسے خوشگوار یا خوش آیند کہا جا سکے۔ لیکن اسی سے تمہارے لئے دودھ جیسی عمدہ غذا پیدا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان موشیوں میں تمہارے لئے طرح طرح کے اور فوائد بھی ہیں۔ اور ان میں سے بعض کا تم گوشت بھی کھاتے ہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ غلام احمد پرویز صاحب کو کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے آپ نے جس دانشمندانہ انداز میں صحیح حدیث کو صحیح معنوں میں سمجھنے کی تشریح فرمائی ہے یہ ان ہی کا خاصہ ہو سکتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں وہی سیرت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح ماڈل ہو سکتی ہے جس کی تائید قرآن پاک کرے۔ تفاسیر اور جزئیات اور چیزیں ہیں لیکن وہ قرآن کے اصول کے مطابق ہونی چاہئیں۔ روایات اور حدیث کے پرکھنے کا معیار ہی یہ ہے کہ ان میں سے جو بھی قرآن کے اصول کے مطابق ہے اسے ہم فوراً مان لیتے ہیں جو اس کے خلاف ہے اسے ہم اسی وقت مسترد کر دیتے ہیں ضرورت ہی نہیں پرکھنے کی کہ راوی کون سے ہیں اسماء الرجال کون سا ہے جامع الحدیث کس قسم کے تھے جو بات اس کے اندر ہے وہ قرآن کے خلاف ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہو نہیں سکتی یہ انکار حدیث عزیزان من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث کا نہیں ہے، انکار یہ ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہو نہیں سکتی کیونکہ قرآن کے خلاف ہے۔ یہ ہے انکار اور یہاں مطالبہ یہ ہے کہ مسلم اور بخاری کی کسی ایک حدیث سے انکار بھی تمہیں دائرہ اسلام سے خارج کر دے گا ایک حدیث کا انکار بھی، اس کا بھی اگر انکار کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی نے جادو کر دیا تھا اور حضور بھول ہی جایا کرتے تھے کہ میں نے نماز پڑھی ہے یا نہیں یہ حدیث ہے۔ اس کا بھی انکار کرو گے تو دائرہ اسلام سے خارج ہو جاؤ گے۔ تو میں نے کہا تھا اگر اس بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت اور عظمت کو قائم رکھنے پر تم دائرہ اسلام سے خارج کرتے ہو تو بیس دفع کر دو میں اپنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس پر حرف نہیں آنے دوں گا۔

لہٰذا ہمیں غور کرنا ہوگا کہ کہیں ان ہی جیسی روایات اور موضوع احادیث کے نتیجے میں جب دیگر مذاھب کے ناقدین مسلمانوں پر تنقید کرتے ہیں تو ہمارے بڑے بڑے علماء اور اکابرین کے پاس بھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں ہوتا کیونکہ ہماری معتبر ترین احادیث کی کتب میں یہ واقعات تحریر ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نو سال کی عمر میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ سے شادی کی جبکہ تاریخی حوالوں سے یہ بات وضاحت کے ساتھ ثابت ہے کہ رخصتی کے وقت ہم سب مسلمانوں کی ماں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر عزیز انیس برس تھی۔ اسی طرح نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی جرأت، بہادری، جوان مردی، شجاعت اور دلیری کے واقعات کچھ اس انداز میں بیان کیے گئے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی رات میں تمام محترم ازواج مطہرات کا حق زوجیت ادا کر دیا کرتے تھے کیونکہ ان میں تیس مردوں جیسی قوت موجود تھی یہ اور ان جیسی موضوع روایات کو ہمارے دین کا لازمی حصہ قرار دے دیا گیا ہے اور ساتھ شرط یہ عائد کر دی گئی ہے کہ ان کا نا ماننے والا منکرِ حدیث ہے۔

جبکہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش مبارکہ سے لے کر حصول نبوت اور حصول نبوت سے لیکر دنیا فانی سے کوچ کرنے تک کن کن مشکلات کا سامنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور اس دین کو بچانے کے لیے کیا کیا قربانیاں دیں اور کس جرأت، بہادری، جوان مردی، شجاعت اور دلیری سے ان مسائل کا سامنا کیا۔ جنگ احد کے موقع پر ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب مسلمانوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکم عدولی کی اور اس مورچہ کو خالی چھوڑ دیا جسے نا چھوڑنے کا حکم دیا گیا تھا چنانچہ کفار کو موقع ملا اور انہوں نے اسی مقام سے مسلمانوں پر دھاوا بول دیا اسی دوران ایک بے رحم تیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خود کو چیرتا ہوا چہرہ انور میں پیوست ہو گیا جس کے نتیجے میں آپ کا اتنا خون مبارک ضائع ہوا کہ آپ پر غشی طاری ہو گئی اور میدان جنگ میں خبر پھیل گئی کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت زیادہ خون مبارک بہہ جانے کے باعث وصال ہو گیا ہے اعلیٰ ترین سپاہ سالاری جرأت، بہادری، جوان مردی، شجاعت، مردانگی اور دلیری کے یہ واقعات ہمیں نسبتاً کم سننے کو ملتے ہیں۔ ذرا اندازہ تو لگایئے تیس سالہ دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور انتیس جنگیں اور غزوات کس قدر کٹھن اور مشکل وقت ہوگا میرے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ وحی الٰہی کا نزول ہوتا ہے' ارشاد خداوندی ہے: الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۙ﴿۳﴾ (سورۃ الشرح' آیت:3)

پھر اس پروگرام کے ابتدائی مراحل میں سختی منزل اور تنہا سفر کے احساس اور ذمہ داریوں کے بوجھ سے تمہاری کمر ٹوٹ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ خدا نے تمہارے رفقاء کی ایک جماعت پیدا کر دی اور اس طرح تمہارا وہ بوجھ بھی ہلکا ہو گیا۔

چنانچہ ان تمام روایات اور احادیث کو صحیح مانا جائے گا جو احکام خداوندی یعنی آیات قرآنی سے متصادم نہ ہوں۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں جس قسم کے نت نئے سوالات نئی نسل کے دل و دماغ میں جنم لے رہے ہیں ان کا صحیح مستند اور سائنٹیفک جواب دینا لازم ہے جو کہ ہمیں اور ہماری آنے والی نسلوں کو صرف اور صرف وحی الٰہی یعنی قرآن پاک سے ہی مل سکتا ہے جو کہ

پوری انسانیت کے لیے سرچشمہ ہدایت ہے جس میں قیامت تک رونما ہونے والے تمام واقعات کا حل موجود ہے۔ بالفاظ دیگر صرف قرآنی تعلیمات کے ذریعے ہی ان سوالات کا صحیح جواب دیا جاسکتا ہے کہ انسانوں کے لیے کون سی چیز حلال ہے اور کوسی حرام جبکہ قرآنِ حکیم کے پیغام کو سمجھنے کا صحیح طریقہ تصریف آیات اور لغت القرآن سے راہنمائی حاصل کرنا ہے۔

اسی لیے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ہر عمل وحی الٰہی کا پابند تھا ان تمام احکامات الٰہی پر پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود عمل کرتے بعدازاں امت کو ان احکامات پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتے۔ چنانچہ اس تمام تر تاز و تگ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی میں کسی قسم کی ردو بدل کا کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿۴۶﴾
فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴿۴۷﴾ (سورۃ الحاقۃ، آیات 44 تا 47)

اس وحی خداوندی میں انسانی خیالات کی ذرہ بھر آمیزش نہیں۔ اگر یہ رسول اپنی طرف سے کوئی بات بنا کر اسے ہماری طرف منسوب کرتا تو ہم اسے دائیں ہاتھ کی محکم گرفت سے پکڑتے۔ اس کے پروگرام کو کبھی آگے نہ بڑھنے دیتے اور اس کے ثبات واستحکام کی قوتوں کو بے کار کر کے رکھ دیتے۔ اس کی اسکیموں کو بے جان کر دیتے۔

اور تم میں کوئی ایسا نہ ہوتا جو ہمیں ایسا کرنے سے روک سکتا۔ (باطل پر مبنی پروگرام آخرالامر ناکام ہو کر رہتا ہے)۔

لہٰذا مندرجہ بالا قرآن حکیم کے اتنے عظیم اور عالمگیر ارشاد کے بعد وحی خفی وحی غیر مکتوب اور وحی غیر متلو کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ بقول شاعر مشرق علامہ محمد اقبال:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گُفتار میں، کردار میں، اللہ کی بُرہان!
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قُرآن!

چنانچہ اگر آج بھی ہم مسلمان اور بالخصوص پاکستان میں بسنے والے مسلمان اس خواب غفلت سے بیدار نہ ہوئے اور اپنی آنے والی نسلوں کے ہاتھ میں قرآن حکیم نہ دیا اور ان کو تصریف آیات اور لغت القرآن سے وحی الٰہی کو سمجھنے کی سعی نا کی تو نوشتہ دیوار ہمارے سامنے ہے یقیناً ہماری آنے والی نسلیں ہماری اس کوتاہی کے سبب ہم کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔ کیونکہ قرآن مجید تا قیامت رہنے والا واحد صحیفہ ہے جس میں ہر دور کے مروجہ حالات کے مطابق ان کا حل موجود ہے ہمارے اسلاف کی قابل قدر کاوشیں سر آنکھوں پر لیکن ہمارے علماء ومشائخ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ موجودہ حالات کے تناظر میں آیات قرآنی کا جائزہ لیں اور سائنٹیفک اصولوں کے تحت اپنی نئی نسل کو پروان چڑھائیں تا کہ وہ منکرین وحی الٰہی کا نہ صرف ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں بلکہ ان کو منہ توڑ جواب بھی دے سکیں کیونکہ اسی میں دنیا اور آخرت کی سچی اور حقیقی کامیابی مضمر ہے۔

نفیسہ فریاد چاہل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقبال کا شاہین ہو کہ پرویز کا سلیم

کہیں لکھا ہوا پڑھا تھا ''نیکیاں زندہ رہتی ہیں جبکہ برائیاں دفن ہو جاتی ہیں۔'' ملت انہیں یاد رکھتی ہے جنہوں نے اس کے لیے کام کیا ہوتا ہے۔ قوم اسے اپنا بانی مانتی ہے جس نے عقل و خرد کو قابو میں کر کے اس سے مشترکہ انسانی مفاد حاصل کیے ہوتے ہیں۔ زندگی جینے کو تو ایک قیدی بھی جی لیتا ہے، حیات تو زنجیروں میں جکڑے لوگ بھی گزار جاتے ہیں مگر یاد فقط فلاحی کام کرنے والے رہ جاتے ہیں۔ لوک کہانیوں کی طرح منتقل ہونے والی داستانوں میں ان کا نام سرِ فہرست ہوتا ہے جو انسانیت کی فلاح کے لیے کام کرتے ہیں۔ اقبال کا شاہین اور پرویز کا سلیم چونکہ ایک ایسا موضوع ہے جس میں دونوں حکماء علامہ اقبال اور علامہ پرویز علیہ الرحمۃ کی تعلیمات کو ایک جگہ اکٹھا کر کے جہاں یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ دونوں نے قرآن کے فیصلوں کو کس طرح اپنے قلم کی نذر کر کے اقوام کے عروج و زوال کی داستانیں رقم کیں وہیں یہ ثابت کرنا بھی ہے کہ مصنفین بات کو گہرائی میں جا کر بیان کرتے ہیں اور اس کے لیے انہیں بہت الفاظ تلاش کر کے بات کو اچھی طرح سے سامعین و قارئین کی نذر کرنا ہوتا ہے جبکہ شاعر چونکہ بذاتِ خود ایک طویل ''مراقبے'' کے بعد اس حال میں پہنچتے ہیں جب وہ کچھ ہی لفظوں میں بات کہہ جاتے ہیں۔ اب سمجھنے والا سمجھتا رہے جو سمجھنا ہے اسے اور رہے سر کھجاتا کہ کیا کہہ گئے۔ (یاد رہے یہاں صرف شاعروں میں سے اقبال کی بات ہو رہی ہے جن کی شاعری پڑھ کر واقعی سر کھجا کر اس کو سمجھنے کی تگ و دو کی جاتی ہے) آج کا جو موضوع دونوں کی مشترکہ سوچ کی عکاسی کرتا ہے اور اس سوچ کا ماخذ قرآن کی آیت ہے ''زمین اللہ کی'' اس حوالے سے علامہ پرویز صاحب اپنے ویڈیو پیغام کے ذریعے بڑے خوبصورت انداز میں اس کی تفسیر کرتے ہیں۔ شروع سے لے کر آخر تک بڑا دلچسپ اور متجسس پیغام ہے۔ جو کہ یہاں درج کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کی نظم ''ارض ملک خداست'' سے اشعار بھی موقع محل کی مناسبت سے درج کیے جائیں گے یوں ہم بھرپور کوشش کریں گے کہ بات اچھی طرح سے واضح ہو جائے۔ پرویز صاحب فرماتے ہیں: قرآن کا نظام ہے کہ معاوضہ یا صلہ محنت کا ہے، سرمائے کا نہیں۔ زمین پہ لکیر کھینچ کے تم اس فصل کے مالک نہیں بن سکتے۔ پہلے تو زمین ہی تمہاری نہیں۔ وہ (زمین) خدا کی ہے۔

حق زمیں را جز متاع ما نگفت

(حق نے زمین کو ہماری متاع/ مال کے سوا کچھ نہیں کہا)

اب آجایئے اس میں فصل کا جو کاروبار ہے، کاشتکاری جسے کہتے ہیں۔ کہا دیکھو تو سہی۔۔ اس میں تمہارا حصہ کتنا ہوتا ہے؟ ایسے بات کرتا ہے قرآن جیسے دو (مشترکہ) بزنس والے آپس میں مشترک بزنس کریں اور کہیں کہ دیکھو بھئی اس میں تمہارا کتنا انویسٹ کیا ہوا ہے، اور ہمارا کتنا ہے؟ تو کہا (خدا نے) کہ (یہاں سورت الواقعہ کی آیات کی تفسیر ہو رہی ہے جو علامہ پرویز صاحب کر رہے ہیں یہ ذیل میں آیات کے نمبرز کے ساتھ ساتھ آئیں گی) یہ کرتے ہو نا کہ جس کی جتنی انویسٹمنٹ ہوتی ہے اتنا ہی اس میں سے اس کو منافع ملتا ہے۔ سارا تو نہیں لے جاتا نا وہ کہا: آیئے اس کاروبار کے اوپر ذرا دھیان تو دیجیے (علامہ پرویز کا یہ انداز ہی ہے جس میں آسانی سے قرآن میں درج آیات کے ذریعے انسان کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ اسلام دراصل ہے کس راستے کا نام)۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿٦٣﴾ (56:63)

''یہ جو تم کھیتی باڑی کرتے ہو، کاشت کرتے ہو، کبھی اس پر غور کیا ہے؟''

ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿٦٤﴾ (56:64)

''اسے تم ہی اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں۔''

تم تو صرف یہ کرتے ہو کہ اس میں حل چلا کے زمین کو ہموار کر کے اس میں ایک دانہ ڈال دیتے ہو۔ اس سے آگے تمہارے اختیار میں ہی نہیں ہوتا کہ اس دانے میں سے کونپل پھوٹے، کر لو جتنی کوشش کرنا چاہتے ہو۔ جو جی میں آئے کر لو۔۔ بتاؤ یہ جو فصل اگتی ہے اس میں اتنا (ہی حصہ ہے نا) جو تم نے زمین کو ہموار کیا ہے اور اس کے اندر دانہ ڈال دیا ہے۔ یہ تمہاری محنت ہے۔ دانے میں سے کونپل، کونپل میں سے پودا، پودے میں سے فصل۔۔۔ کر سکتے ہو تم۔۔۔؟ وہ کون کرتا ہے۔۔۔؟

لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿٦٥﴾ (56:65)

''اگر ہم چاہیں تو اسے ریزہ ریزہ کر ڈالیں اور تم حیرت کے ساتھ باتیں بناتے رہ جاؤ۔''

تم کرتے ہو یا ہمارے قانون کے مطابق یہ سب کچھ ہوتا ہے؟ یہ نظام ہی دانہ، دانے میں سے فصل تبدیل کرنے کا۔ کبھی ہنگامی طور پر ایسا ہو جائے کہ بارش ہی وقت پر نہیں ہوتی۔ تو ایک دانے میں سے سات سات سو دانے بننے تو ایک طرف جو تم نے بیج ڈالا ہے وہ بھی ضائع ہو جاتا ہے اور تم ماتھا پکڑ کے بیٹھ جاتے ہو کہ ہماری محنت بھی گئی اور ہمارا بیج بھی گیا۔ کہا کہ اس میں تمہارے بیج کو اس طرح کی فصل کے اندر تبدیل کس نے کیا؟

اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿٦٨﴾ (56:68)

''اچھا یہ بتاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو۔''

ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿٦٩﴾ (56:69)

''اسے بادلوں سے تم ہی اتارتے ہو یا ہم برساتے ہیں''

اب اس کے بعد زمین میں تو ڈال دیا تم نے اسے اب پانی کی ضرورت ہے۔ وہ بارش کی شکل میں ہو یا نہروں کی شکل میں۔ (اگر بارش نہ ہو تو نہریں بھی سوکھ جائیں اور زمین کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے) نہروں کی شکل کا پانی بھی ابتداً وہ برف کی شکل میں پہاڑوں پہ ہوتا ہے۔ کہا یہ چھوڑو کہ تمہارا پیدا کردہ نہیں۔ ذرا غور کرو کہ یہ بارش جو برستی ہے۔۔ سمندر کا پانی دنیا میں غالباً 1/5 حصہ خشکی ہے سمندر ہی سمندر ہے لیکن وہ پانی یہ کہ ایک گھونٹ پانی پی نہیں سکتے۔۔۔۔ پانی میں زندگی ہوتی ہے اور سمندر کا پانی جو اس قدر لا انتہا مقدار میں ہے وہ مرگ آفریں ہوتا ہے۔۔۔ وہ ایک نظم ہوا کرتی تھی نا

Water water everywhere
Not a drop to drink

کہا اس پانی کی یہ کیفیت ہے۔ ایک بوند اس پانی کا کھیتی میں ڈال دو گے، کھیتی جل کے راکھ ہو جائے گی۔ کہا ذرا انتظام ہمارا سوچو تو سہی۔ بات آ گئی ہے سامنے۔ سمندر کا پانی پینے کے لیے یہ تمام عرب ممالک۔۔ یہ خلیج فارس والے وغیرہ جو ہیں، ان کے ہاں بہت کمی ہے پینے والے پانی کی۔ سمندر کے کنارے یہ ملک واقع ہیں (مگر) ایک گھونٹ پی نہیں سکتے۔ انہیں پینے کے لیے سٹیم کرنا پڑتا ہے پانی سمندر کا۔ کشید کہتے ہیں جسے۔ اس میں سے جو کھاری مادے ہوتے ہیں ان کو الگ کر پانی کو پینے کے قابل بناتے ہیں (یہ اس زمانے کا نظام تھا اب پلانٹس لگ گئے ہیں جو پانی فلٹر کرتے ہیں) وہ اتنا مہنگا پڑتا تھا۔ میں نے بھی دیکھا وہاں جب عمرہ کرنے گیا تھا۔ ایک بوتل پانی کی جس میں زیادہ سے زیادہ تین گلاس نکلتے ہیں (ایک لیٹر) اس میں سے نکلتے تھے۔ دس روپے میں ملتی تھی۔ تین روپے میں ایک گلاس ہوتا تھا۔ میں اپنی تریں مار جانداساں گلاس نہیں سی پینڈا ،بھئی تن روپے ہور پے جان گے۔ (میں اپنی پیاس نظر انداز کر لیتا تھا گلاس نہیں تھا پیتا۔ بھئی تین روپے اور پڑ جائیں گے۔) وہ کشید کرنے پر اتنی کوسٹ آتی ہے کہ ہم افورڈ ہی نہیں کر سکتے۔ ایک گلاس پانی کا پینے کے لیے اسی سمندر کے پانی کو اس قابل بنانا۔ تو کھیتی کو دینے کے لیے پانی تو بہت زیادہ چاہیے۔ اگر کشید کر کے پانی کھیتی کو دیں تو پانی تو بہت زیادہ چاہیے۔ اگر کشید کر کے پانی کھیتی کو ڈالا جائے اور وہاں سے فصل ہو تو سارے ملک کی رقم (آمدن) گیہوں اگانے میں صرف ہو جائے۔ کہا یہ چیزیں پیش پا افتادہ ہیں۔ تم چلتے پھرتے رہتے ہو غور نہیں کرتے کبھی۔ سوچو تو سہی۔۔۔ کھیتی کو پانی ایسا چاہیے جیسے کشید کیا ہوا (میٹھا پانی) جسے حاصل کرنے کی کیفیت یہ کہ سمندری پانی کو پینے کے قابل بنانے کے لیے ایک گلاس کے اوپر اتنی لاگت۔ وہ کہتے تھے کہ جی ہم یہ کوسٹ کے اوپر نہیں دیتے۔ اس کو subsidies بھی کرتے ہیں۔ گلاس تین روپے میں پڑتا نہیں تھا ان کو۔ اصل میں دس روپے میں گلاس پڑتا تھا۔ کہتا ہے یہ جو کیفیت ہے تمہاری اس پانی کو کشید کرنے کی (اس کے برعکس ہماری کیفیت کیا ہے) اسی سمندر کے اوپر سورج کی حرارت اس سے evaporation ہوتی ہے۔ کشید کا یہ پراسیس شروع ہو گیا ۔کشید کا پراسیس یہی ہوتا ہے کہ اس میں پانی سے بھاپ اڑتی ہے۔ پانی میں یہ خصوصیت رکھی کہ جب وہ کشید کیا جائے تو اس کے اندر گھلے مادے ہوتے ہیں وہ نیچے رہ جاتے ہیں خالص پانی بھاپ بن کے اڑ جاتا ہے۔ (جو پانی اوپر جاتا ہے وہ پینے کے قابل ہوتا ہے) کہا سوچو تو سہی کہ اتنا بڑا سمندر اس کا پانی کشید کرنا ہے کتنی بڑی بڑی بھٹیاں چاہئیں، ہم نے ایک بھٹی لگا

رکھی ہے (سورج) سمندر کی جتنی کھاری معدنیات ہوتی ہیں وہ سمندر میں چھوڑ دیتا ہے اور (سورج) کی کرنیں کشید شدہ پانی کے ڈول بھر بھر کے اوپر لے جاتی ہیں۔ اگر وہ پانی وہیں برس جائے تو سمندر کا پانی سمندر میں ہی رہے۔ کہا وہاں سے پانی کی شکل میں نہیں رکھا بھاپ کی شکل میں رکھا جسے بادل کہتے ہو تم۔ (پھر آگے ہواؤں کا کام شروع ہوتا ہے جسے قرآن کہتا ہے: ''ہم نے بھیجیں حمل والی ہوائیں'') ہوائیں اس بادل کو دھکیلتے ہوئے لے جاتی ہیں پھر ہمارا انتظام ہے کہ جس مقام پہ پانی یعنی بارش برسانی ہوتی ہے وہاں یہ ہوائیں ٹھنڈ پیدا کرتی ہیں۔ اس ٹھنڈک کی وجہ سے بادل بھاری ہوتا ہے پھر پانی کے قطروں کی شکل میں تبدیل ہوتا ہے اب وہی سمندر کا کھاری پانی ہمارے نظام کی وجہ سے میٹھا پانی بنا اور تمہاری زمینوں پر برسا۔ وہ کشید شدہ پانی تمہاری زمین پہ گرتا ہے۔ یہ واٹر سپلائی کا نظام ہے۔ فرمایا کہ یہ جو پانی برسا ہے اس میں جناب کا کتنا حصہ ہے اور ہمارا کتنا حصہ ہے۔۔۔؟

تو یہ کہ اس بزنس میں جو زمین ہے وہ ہماری ہے تمہاری نہیں ہے۔ دانہ ایک ڈالا ہے تم نے، پانی نہ ہو تو وہ بھی ویسے کا ویسے ہی پڑا رہے گل سڑ جائے۔ پانی چاہیے اس کو کشید شدہ/ سکلڈ واٹر۔ پھر اگر ایک ہی وقت میں ساری بارش برس جائے تو پھر بھی کھیتی ہوتی؟ (باقی کا جو پانی اس وقت نہیں چاہیے) ہم نے پہاڑوں پر ریزروائر بنا رکھے ہیں۔ جہاں برف کی شکل میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ گرمیوں میں اس برف کو پگھلاتے ہیں جو کہ پانی کی شکل میں تمہارے گھروں کے آگے سے گزرتا جاتا ہے۔ تمہارے کھیتوں کے پاس سے گزرتا جاتا ہے (جس سے زیرِ زمین پانی کی سطح بھی نیچے نہیں جاتی ٹیوب ویلوں کے ذریعے بھی نکالو اور فصل کو دو) اب فرمایئے جناب کا کتنا حصہ ہے اور ہمارا کتنا نکلتا ہے؟ کاروبار کر رہا ہے۔ بڑا عجیب انداز ہے سمجھانے کا۔ پھر کہا:

نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً (56:73)

کہا جو کچھ ہم نے اس وقت تک کہا ہے وہ اس لیے ہے کہ تم غور و فکر کر کے سوچ بچار کر کے ایک نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرو۔ ''تذکرہ'' اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو سامنے رکھ کر اس پہ غور و فکر کرنا جیسے حساب کا سوال حل کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک نتیجے پر پہنچو۔ کہا یہ سارا پراسیس، سارا نظام کھیتی باڑی کا جس کو تم اپنے آپ میں وحدہٗ لاشریک سمجھتے ہو فصل کا کہ ہماری ہے یہاں اقبال فرماتے ہیں:

دہ خدایا! نکتۂ از من پذیر
رزق و گو راز وے بگیر او را مگیر

(اے گاؤں کے خدا (اے وڈیرے زمیندار) مجھ سے ایک باریک بات قبول کر+ زمین سے رزق اور قبر حاصل کر اس پر قبضہ نہ کر) اور پھر کہتا ہے کہ دیانتدار بزنس مین کی طرح حساب کرو آ کر، ہم دھاندلی نہیں کرنا چاہتے، ہم تمہارا کچھ نہیں چھیننا چاہتے۔ ایمانداری سے اللہ دی سوں کھا کے تسی آپ ای دسو کہ اس میں تمہارا کتنا ہے اور ہمارا کتنا ہے؟ جو تمہارا ہے تم لے لو۔

جو ہمارا ہے ہمیں دے دو۔ نہ لیند ابھلے نہ دیند ابھلے (نہ لیتا بھولے نہ دیتا بھولے) ایمانداری نال (ایمانداری سے) کہا تم کہو کہ جی ٹھیک ہے حساب کر دیا اس میں سے ہم نے اپنا لے لیا جو باقی بچا ہے وہ تو شاید نوے فیصد ہوگا تو آپ کو کہاں دیں؟ آپ تو یہ بات پردے کے پیچھے کرتے ہیں (پرویز صاحب کسی اور لفظ کا استعمال کرتے ہیں قرآن کی رو سے پردے کے پیچھے ٹھیک رہے گا) سامنے آتے ہی نہیں ہیں۔ کہاں دیں اس کو۔۔۔؟

عزیزانِ من! ایک فقرہ: یہ بھوکوں کو دے دو ہمیں پہنچ جائے گا۔۔۔ پہنچ جائے گا ہم تک (آہ کیا اندازِ الفاظِ ادائیگی ہے یہ بابا جی کے منہ سے سننا زیادہ پرتاثیر ہے)

عزیزانِ من! سارا نظام معیشت کا آپ کا اکنامک سسٹم ایک مثال میں حل کر کے رکھ دیا ہے۔

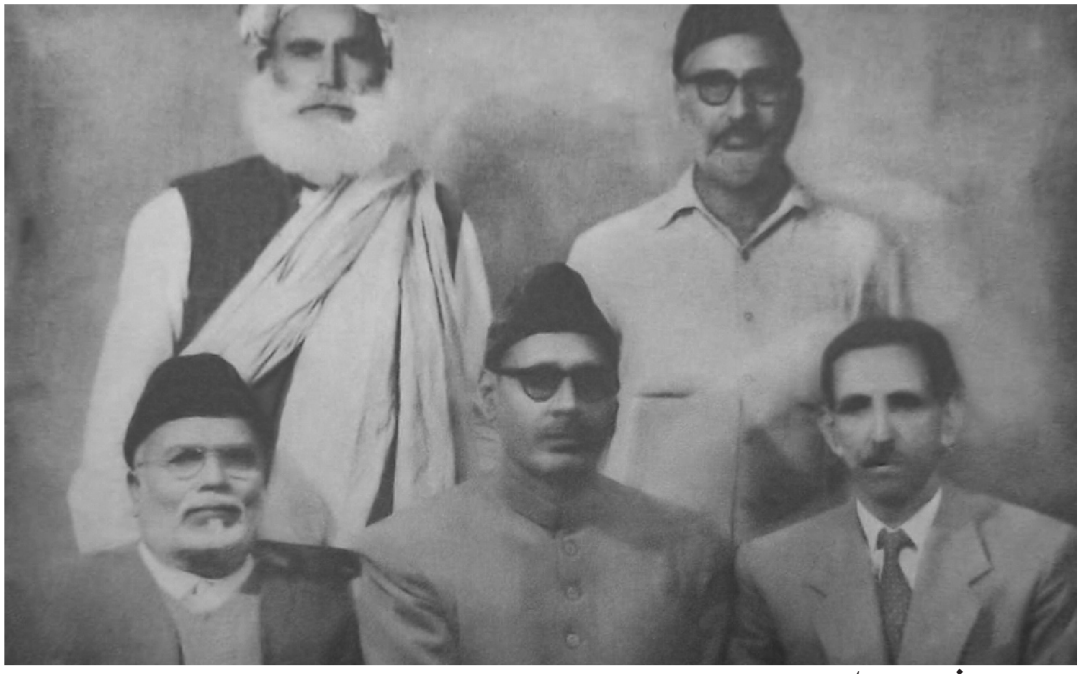
وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ (سورۃ النجم آیت:39)

''تم اپنی محنت کے حق دار تھے'' ہم اس میں سے ایک دانہ بھی نہیں لینا چاہتے۔ لیکن یہ تمہاری بھی زیادتی ہوگی نا۔ باطن الارض للہ ظاہر است ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است (زمین اللہ کی ہے قرآن کی یہ آیت ظاہر بھی رکھتی ہے اور باطن بھی اس کا باطن مفہوم بالکل واضح اور ظاہر ہے+ جو کوئی اس ظاہر کو نہیں دیکھتا وہ کافر ہے) یہاں علامہ اقبال کی بانگِ درا سے پوری نظم:

تکرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز
دونوں یہ کہہ رہے تھے، مرا مال ہے زمیں
کہتا تھا وہ، کرے جو زراعت اُسی کا کھیت
کہتا تھا یہ کہ عقل ٹھکانے تری نہیں
پُوچھا زمیں سے مَیں نے کہ ہے کس کا مال تُو
بولی مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقیں
مالک ہے یا مزارعِ شوریدہ حال ہے
جو زیرِ آسماں ہے، وہ دھَرتی کا مال ہے

سانحہ ارتحال

انتہائی دکھ اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بزم طلوع اسلام سوات کے سابقون الاولون میں سے ایک فعال، عالم و فاضل بزرگ کارکن شہزادہ لالا ساکن فرحت آباد، طویل علالت کے بعد اس جہان فانی سے رُخصت ہو گئے۔ قرآنی فکر سے ان کی وابستگی کوئی 60 سال سے زائد پر محیط ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں بلند مقام عطا فرمائیں اور لواحقین کو صبر جمیل عنایت فرمائیں۔ ادارہ لواحقین کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ (چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام)



شیخ سراج الحق، علامہ پرویز علیہ الرحمۃ، عبدالرب، بخت جمال خاں (صدر صاحب)



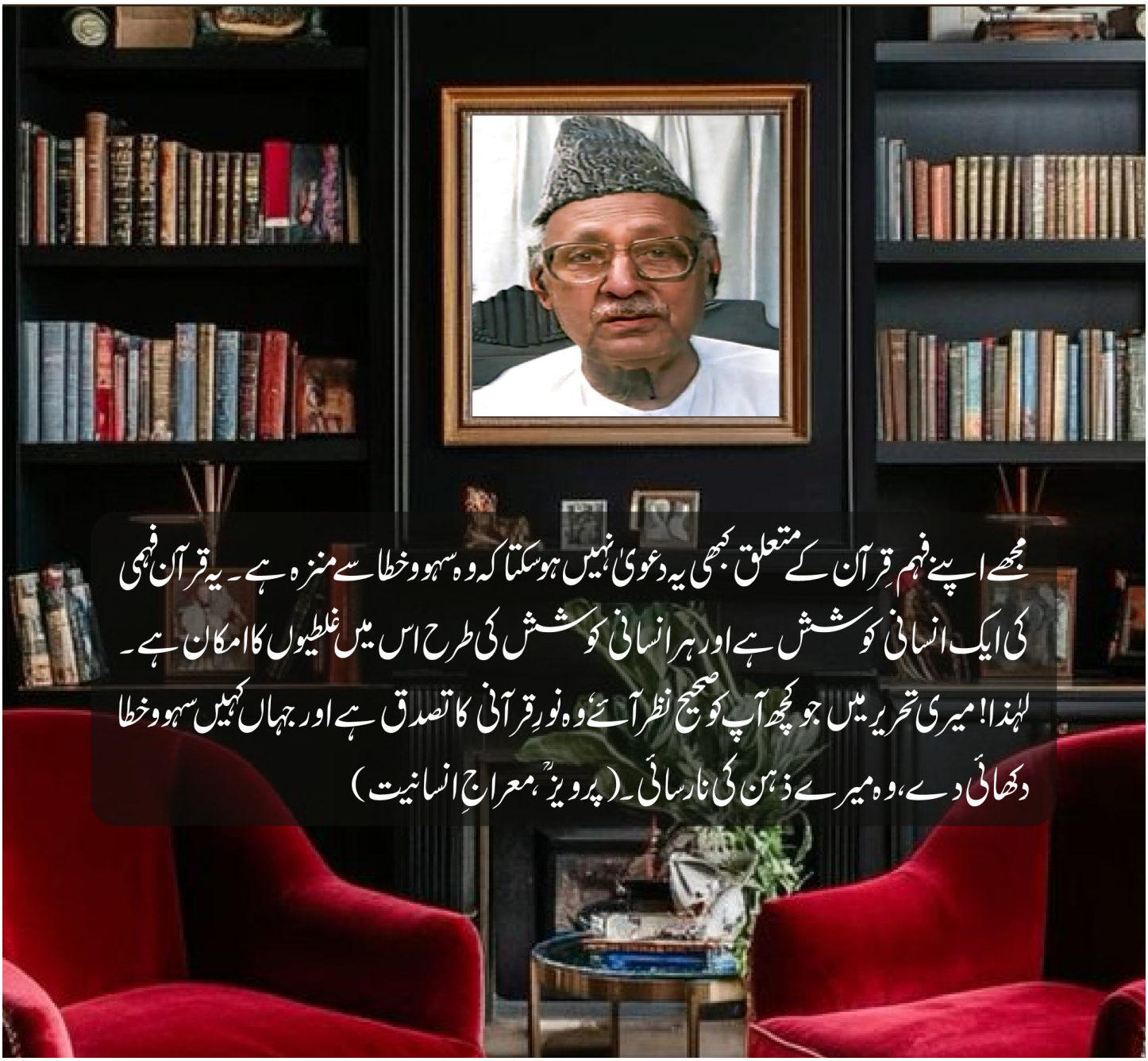
گجرات میں خطاب کا ایک منظر، دائیں شیخ قدرت اللہ ایڈووکیٹ بائیں ڈاکٹر اکرم مرزا تشریف فرما ہیں

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.78
ISSUE
02

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/idaratolueislam1/ www.youtube.com/idaratolueislam



مجھے اپنے فہم قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے، وہ میرے ذہن کی نارسائی۔ (پرویزؒ، معراجِ انسانیت)